عطیہ سید کی فکشن میں نفسیاتی اور فلسفیانہ عناصر : تجزیاتی مطالعہ

تحقیقی مقالہ برائے ایم فل (اُردو)

نگران مقالہ	مقالہ نگار
ڈاکٹر عبدالستار ملک	عطیہ حسین
لیکچرار، شعبہ اُردو	رول نمبرBN735250
علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد	

شعبہ اُردو

علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد

۲۰۱۷-۲۰ء

سندِ توثیق

تصدیق کی جاتی ہے کہ عطیہ حسین، ایم۔ فل اُردو، رول نمبر BN735250 نے میری نگرانی میں مقالہ برائے ایم۔ فل اُردو بہ عنوان ''عطیہ سید کی فکشن میں نفسیاتی اور فلسفیانہ عناصر: تجزیاتی مطالعہ''، مکمل کیا ہے۔ اس کی باقاعدہ اجازت شعبہ اُردو کے بورڈ آف سٹڈیز کے اجلاس میں دی گئی تھی۔ میں ذاتی طور پر ان کے کام سے مطمئن ہوں۔ میں انھیں یہ مقالہ شعبہ اردو علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد میں جمع کرانے کی اجازت دیتا ہوں اور ان کے زبانی امتحان کے انعقاد کی سفارش کرتا ہوں۔

ڈاکٹر عبدالستار ملک

لیکچرار، شعبہ اردو

علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد

اقرار نامہ

میں عطیہ حسین، رول نمبر BN735250 حلفیہ بیان دیتی ہوں
کہ اس مقالے میں پیش کیا گیا کام میرا ذاتی ہے اور علامہ اقبال
اوپن یونیورسٹی کے ایم فل اردو سکالر کی حیثیت سے ڈاکٹر
عبدالستار ملک کی نگرانی میں کیا گیا ہے۔ میں نے یہ کام کسی اور
یونیورسٹی یا ادارے میں ڈگری کے حصول کے لیے پیش نہیں
کیا اور نہ آئندہ پیش کروں گی۔

عطیہ حسین

فہرست ابواب

پیش لفظ

زیرِ نظر ایم۔ فل کا مقالہ "عطیہ سید کی فکشن میں نفسیاتی اور فلسفیانہ عناصر: تجزیاتی مطالعہ" پر مبنی ہے۔ عطیہ سید کو واقعات، فضابندی، کردار نگاری کے ساتھ ساتھ نفسیاتی کشمکش اور فلسفیانہ نقطہ نظر کی وجہ سے سراہا گیا ہے۔ وہ اپنی فکشن میں سیاسی، سماجی، معاشی، معاشرتی، اقتصادی اور سب سے بڑھ کر افراد کی داخلی کشاکش کو فلسفیانہ انداز سے پیش کرتی ہیں۔ یہ مقالہ عطیہ سید کی فکشن میں موجود نفسیاتی اور فلسفیانہ عناصر کے تجزیاتی مطالعے پر مشتمل ہے۔ اس مقالے کے پہلے باب میں عطیہ سید کی شخصیت اور ذہنی ارتقا کے ساتھ ساتھ اُردو افسانوی ادب میں نفسیات نگاری پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

دوسرے باب میں عطیہ سید کے افسانوں کے کرداروں کا نفسیاتی مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔ کرداروں کا یہ مطالعہ نفسیاتی، سماجی، اقتصادی اور جنسی بنیادوں پر کیا گیا ہے۔

تیسرے باب میں عطیہ سید کی فکشن میں شعور اور لاشعور کی کشمکش کا مطالعہ کیا گیا ہے۔ جس میں تحلیلِ نفسی کے اثرات، لاشعور محرکات، جنس اور لاشعور، جبریت اور خود گریزی کے رجحانات کے علاوہ شعور، شعور کی رو اور تحت الشعور کا مطالعہ کیا گیا ہے۔

چوتھا باب عطیہ سید کے ناول "غبار" میں نفسیاتی اور فلسفیانہ عناصر کے تجزیاتی مطالعہ پر مشتمل ہے۔

پانچواں باب عطیہ سید کے افسانوی مجموعوں کے نفسیاتی اور فلسفیانہ عناصر پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

میں اللہ تعالیٰ کی پاک ذات کی احسان مند ہوں کہ یہ مقالہ آپ کے سامنے پیش کرنے کے قابل ہوئی۔ شعبہ اُردو کے تمام اساتذہ کے لیے دعا اور شکر گزاری ہے کہ انھوں نے نہ صرف کورس ورک میں بلکہ تحقیقی مقالے میں بھی اپنی رہنمائی اور مشاورت سے نوازا۔

میں استاد محترم ڈاکٹر عبدالعزیز ساحر صاحب کی بے حد ممنون ہوں کہ انھوں نے شفقت بھرے انداز میں میری رہنمائی کی۔ میرے شفیق استاد محترم ڈاکٹر عبدالستار ملک صاحب جو میرے نگران ہیں، ان کا دل سے شکریہ ادا

کرتی ہوں، کیونکہ اگر وہ رہنمائی نہ فرماتے تو یہ مشکل مرحلہ کبھی سر نہ ہوتا۔ میں پنجاب یونیورسٹی، لاہور کے استاد محترم ڈاکٹر ضیاالحسن صاحب کی بھی تہ دل سے مشکور ہوں جنھوں نے قدم قدم پر اپنے قیمتی مشوروں سے نوازا۔

میں اپنے بہن بھائیوں اور خاص طور پر اپنے والد محترم کیپٹن (ر) غلام حسین ساجد اور والدہ ساجدہ حسین کی شکر گزار ہوں کہ جنھوں نے اپنی دعاؤں، مدد اور سہارے کے زریعے مجھے اس مقام تک پہنچایا۔ سعدیہ، نادیہ، اقرا اور رمشاء کا بھی شکریہ کہ جنھوں نے مجھے عائلی زندگی کے بکھیڑوں سے آزاد کر کے ہمہ تن تحقیق کے لیے فارغ رکھا۔ میں اپنے بڑے بھائیوں عدیل احمد، قدیر احمد اور چھوٹے بھائی احسن محمود کی بھی ممنون ہوں کہ جنھوں نے مواد کی فراہمی سے لے کر کمپوزنگ تک مقالے کی تیاری کے ہر مرحلے میں میری عملی سطح پر معاونت کی۔ میں یہ مقالہ اپنے والد محترم کیپٹن (ر) غلام حسین ساجد کے نام کرتے ہوئے خوشی محسوس کر رہی ہوں کیونکہ آج میں جو کچھ بھی ہوں ان کی وجہ سے ہوں۔ اللہ پاک ان کا سایہ ہمارے سر پر سلامت رکھے (آمین)

عطیہ حسین

متعلم ایم۔ فل (اُردو)

باب اوّل

عطیہ سید کی شخصیت اور نفسیات نگاری کی روایت

عطیہ سید کی شخصیت اور نفسیات نگاری کی روایت

شخصیت

خاندانی پس منظر:

عطیہ سید معروف افسانہ نگار، مترجم، کالم نگار، ماہرِ اقبالیات اور ناول نگار ہیں۔ عطیہ سید معروف عالم، ادیب، نقاد، محقق، دانشور اور استاد ڈاکٹر سید عبداللہ کی بیٹی ہیں۔ ان کا گھرانہ سادات سے تعلق رکھتا ہے۔ عطیہ سید نجیب الطرفین سید ہیں۔ عطیہ سید کے نانا بخاری ہیں اور داد مشہدی خاندان کے فرد تھے۔ آپ کے والد منگلور گاؤں کے ایک مقام زیارت میں رہتے تھے۔ آپ کے دادا کا نام سید نور احمد شاہ تھا، جو اپنے زمانے کے صاحب علم اور طریقت بزرگ تھے۔ عطیہ سید کے آباواجداد ہندوستان میں اسی راستے سے داخل ہوئے جس سے بابر وارد ہوا تھا اور پنجاب میں چکوال کے علاقے میں آباد ہو گئے۔ عطیہ سید کے والد کے جدامجد کے چار بھائی تھے، ایک کی گمشدگی کی روایت دست یاب ہے، باقی تین پنجاب میں رہے۔ عطیہ سید کے والد کے جدامجد سکھوں کے خلاف جہاد کی غرض سے شمال کی جانب روانہ ہوئے، اور بعد میں شمالی جنگلوں میں ہی ہمیشہ کے لیے جابسے۔ عطیہ سید کے دادا عالمِ دین بھی تھے، اور طبیب کی حیثیت سے بھی مشہور تھے۔ انھوں نے کبھی بھی اپنی حکمت کو روپیہ پیسہ کمانے کا ذریعہ نہیں بنایا۔ وہاں وہ دور دور تک لوگوں کے گھر جا کر ان کا مفت علاج کیا کرتے اور "طبیب میاں" کے نام سے جانے جاتے تھے۔ اس وقت سادات خاص طور پر سیدوں میں ہی شادی کرتے تھے، آپ کے والد نے دو شادیاں کیں۔ پہلی بیوی کے انتقال کے بعد ڈاکٹر سید عبداللہ نے دوسری شادی بی بی حوا سے کی جن کے بطن سے تین بچے پیدا ہوئے۔ ایک بھائی کا انتقال جلدی ہی ہو گیا تھا، جن کا نام سید زبیر تھا۔ باقی دو سید سجاد حیدر اور عطیہ سید ہیں۔ عطیہ سید کے بھائی سید سجاد حیدر کو بھی شاعری سے بہت لگاؤ تھا۔ ان کی جدید شاعری کے دو مجموعے بھی شائع ہو چکے ہیں۔ سید سجاد شاعری کرنے کے ساتھ ساتھ اڈووکیٹ بھی تھے۔ سید سجاد کا انتقال Appendix کی وجہ سے ہوا۔ عطیہ سید کی والدہ بھی پڑھی لکھی خاتون تھیں۔ انھوں نے عطیہ سید کی زندگی

میں بہت اہم کردار ادا کیا۔ وہ خود بھی ایک استانی تھیں۔ وہ "ساقی "(دہلی) میں آرٹیکل لکھتی تھیں۔ عطیہ سید کی والدہ اس بات کی قائل تھیں کہ عورت کی اپنی شخصیت اور پہچان ہو۔ انھوں نے اپنے بچوں کی تربیت بہت ہی اچھے انداز میں کی۔

"میری والدہ کی خواہش تھی عورت ہو تو انٹی لیکچوئل ہو۔"[1]

عطیہ سید کی والدہ ڈاکٹر سید عبد اللہ کا نام نہیں لیتی تھیں، بلکہ انھیں " شاہ صاحب " کہہ کر بلاتی تھیں۔ ان کے والدین بہت حسین تھے۔ عطیہ سید کہتی ہیں۔

" میرے نانا، نانی اور والد اور والدہ بے حد حسین تھے کیونکہ وہ مشہدی سید تھے۔ میں خود بھی جب کبھی غیر ممالک میں جاتی ہوں تو وہاں کے لوگ یہ یقین نہیں کرتے کہ میں پاکستانی ہوں۔ وہ کہتے تھے کہ پاکستانیوں کی شکلیں اور طرح کی ہوتی ہیں۔ میں ان سے کہتی ہوں کہ میں خالص پاکستانی ہوں کیونکہ میرے آباؤاجداد آزادی سے پہلے بھی لاہور میں ہی رہتے تھے۔"[2]

اپنے والد کو عطیہ سید "آجی " کہا کرتی تھی۔ عطیہ سید کے والد اپنی والدہ کو بی بی جان کہہ کر پکارتے تھے۔ عطیہ سید کے والد نے خوبصورتی اپنی والدہ سے لی۔ انھوں نے اپنے افسانوی مجموعے "دشت، بارش اور رات" میں اپنے والد کے بارے میں ایک مضمون لکھا۔ جس میں انھوں نے اپنے والد کی شخصیت کے بارے میں لکھا۔

"انھیں اپنی والدہ کی نہ صرف دراز قامت، سفید رنگ، خوبصورت ہاتھ اور نفیس انگلیاں جو سرجنوں اور مصوروں کا مقدر ہیں حاصل ہوئیں۔ بلکہ ان کا شعری ذوق بھی GENES کے ساتھ یوں منتقل ہوا کہ زندگی اور ادب کی لطافتوں کا عشق آجیؔ کے رگ وپے میں مکمل طور پر رچ بس گیا۔"[3]

عطیہ سید کے دادا جی بھی پڑھے لکھے تھے۔ حکمت کو جانتے تھے۔ لوگ انھیں "شاہ صاحب" اور "طبیب میاں کے نام سے پکارتے تھے۔ اپنے دادا جی کے بارے میں لکھتی ہیں

> "گرچہ۔۔۔۔ آجی کے والد۔۔۔۔ کو۔۔۔۔۔ عربی اور فارسی پر بھی دسترس تھی۔ وہ ہمیشہ سفید رنگ کا خلقہ اور کالی رنگ کی پگڑی باندھتے تھے۔ ان کے نقوش بڑے متناسب، رنگ سرخ و سفید اور جلد پیاز کی جھلّی کی طرح نفیس تھی۔ ان کے سراپے میں جسمانی جمال اور روحانی جلال بڑا واضح تھا۔ اس کا اظہار ان کی چمکیلی آنکھوں کی گرفت تھی۔۔۔۔ وہ سخت نظم و ضبط کے قائل تھے۔"[4]

عطیہ سید کا تعلق علمی وادبی گھرانے سے ہے۔ عطیہ سید کے والد ڈاکٹر سید عبداللہ عالم، محقق، مفکر، ادیب اور استاد تھے۔ انھیں شاعری سے بہت لگاؤ تھا۔ وہ اورینٹل کالج کے پرنسپل تھے، اس کے علاوہ وہ پاکستان اردو اکیڈمی کے ڈائریکٹر اور اردو دائرہ معارف اسلامی کے مدیر بھی رہ چکے تھے۔ ان کی مشہور تصانیف میں ''اشاراتِ تنقید'' نقدِ میر'' مسائلِ اقبالاور ''اعجازِ اقبال'' عطیہ سید کی والدہ بھی شاعری کا شغف رکھتی تھیں۔

> "ہمارا علمی ماحول تھا۔ ہماری باتیں بھی علمی تھیں۔ ٹیبل پر بھی جب ہم کھانا کھاتے تھے تو ہم ذاتی قسم کی باتیں نہیں کرتے تھے بلکہ میرے والد انٹی لیکچوئل بات کرتے تھے۔"5

عطیہ سید کے گھر ادبی لوگوں کا آنا جانا تھا۔ صوفی غلام مصطفیٰ تبسم عطیہ سید کے والد کے خاص دوستوں میں سے تھے۔ عطیہ سید کی نانی جان صوفی غلام مصطفیٰ تبسم کی بیوی کی مونہہ بولی بہن تھیں، اور ان کی بیٹی عطیہ سید کی سہیلی تھیں۔ ڈاکٹر سلمان تاثیر کے گھرانے سے بھی ان کے گہرے اور قریبی تعلقات تھے۔ ڈاکٹر سلمان تاثیر کی بہن عطیہ سید کو کافی عرصہ پڑھاتی رہیں۔ جس کالج میں ڈاکٹر سلمان تاثیر کی بہن پڑھاتی تھیں، اسی کالج میں عطیہ سید نے بھی پڑھانا شروع کر دیا۔

"میں نے بچپن سے اپنے گھر میں بہت بڑی علمی و ادبی شخصیات کو دیکھا ہے۔ وہ جب بیٹھے سنجیدہ گفتگو کر رہے ہوتے تھے تو میں بھی وہاں جا کر بیٹھ جاتی تھی اور سنتی رہتی تھی۔ بچپن میں مجھے ان کی باتیں سمجھ نہیں آتی تھیں۔ مگر وہ سب باتیں میرے لاشعور میں جمع ہوتی رہیں۔ جو بعد میں میری تخلیقات کی صورت میں سامنے آئیں۔"[6]

نام اور پیدائش:

عطیہ سید عہدِ حاضر کی ممتاز اور نمائندہ فکشن نگار ہیں جن کی ادبی حیثیت غیر معمولی ہے۔ وہ معروف عالم، ادیب، مفکر اور استاد ڈاکٹر سید عبداللہ کے گھر 9 جون 1942 لاہور میں پیدا ہوئیں۔[7] ان کا گھر "المامن" کہلاتا تھا جو کہ عطیہ سید کے دادا نے بنوایا تھا جو کہ اندرونِ شہر چینیا والی مسجد کے قریب واقع تھا۔ وہاں مشہور وزیر خان کی مسجد بھی ہے جہاں سیاح اب بھی سیر و تفریح کے لیے آتے ہیں۔ اسی مسجد سے عطیہ سید کے والد ڈاکٹر سید عبداللہ نے مولانا احمد علی سے درس لیا کرتے تھے۔ انھوں نے میٹرک بھی وہاں پر موجود اسلامیہ ہائی سکول خزانہ گیٹ سے حاصل کیا اور وہاں پر واقع منٹو پارک میں بیٹھ کر امتحان کی تیاری بھی کیا کرتے تھے۔ عطیہ سید نے اپنی زندگی کا بیشتر حصّہ اپنے والد کے گھر (المامن) میں گزرا۔ یہ گھر عطیہ سید کے والد ڈاکٹر سید عبداللہ نے بنوایا تھا۔ آج کل عطیہ سید اتاترک بلاک گارڈن ٹاؤن لاہور میں رہائش پزیر ہیں۔ اپنے گھر "المامن" کا نقشہ کھینچتے ہوئے عطیہ سید نے ایک جگہ لکھا۔

"ایک۔۔۔ مکان اور اس میں ایک وسیع کمرہ جس میں ایک چار پٹوں والا دریچہ جو ایک بیری کے پرانے گھنے جنگل نما سر پر کھلتا ہے۔ جس میں بے شمار چڑیوں کے گھونسلے ہیں۔ اور ان کے چہچہانے کی آواز اس وقت بھی میرے کانوں میں آ رہی ہے۔ کمرے میں بچھے بہت پرانے انداز کے پلنگ پر ایک شخص، خالص مشرقی انداز میں کاغانی پٹی کی لوئی کو اپنے گرد لپیٹے، اونی ٹوپی پہنے، تفکّر میں سر تا پا غرق، بیری کی جانب نگاہیں جمائے کتابوں کے انبار میں گھرا بیٹھا ہے۔۔۔۔ پھر اسی شخص کی۔۔۔ آنکھیں میری توتلی زبان سے "آجی" کا لفظ سن کر فرطِ مسرت سے مسکراتی ہیں۔"[8]

عطیہ سید کا نام ادبی شخصیات کے نام پر رکھا گیا۔اپنے نام کے حوالے سے کہتی ہیں۔

> "میرے والدین نے میرا اور میرے بھائی کا نام writers کے نام پر رکھا۔ میرے والدین علامہ اقبالؒ سے متاثر تھے۔اس نسبت سے انھوں نے میرا نام عطیہ فیضی کے نام پر رکھا اسی طرح میرے بھائی کا نام بھی مشہور writer سید سجاد حیدر یلدرم کے نام پر سید سجاد حیدر رکھا گیا۔"[9]

عطیہ سید کے گھر والوں نے سکول میں ان کا نام عطیہ سید محمد عبد اللہ لکھوایا تھا۔عطیہ سید چونکہ انفرادیت کی قائل ہیں،اس لیے جب میٹرک کے فارم فل کروائے گئے تو انھوں نے اپنا نام عطیہ سید لکھوا دیا۔ عطیہ سید کہتی ہیں۔

> "نام کی تبدیلی کی وجہ سے اکثر لوگوں کو پتا نہیں چلتا کہ یہ عطیہ سید کون ہیں۔اگر میں اپنا نام عطیہ عبداللہ یا عطیہ سید عبداللہ رکھتی تو سب کو پتا چل جاتا۔"[10]

ابتدائی و اعلیٰ تعلیم:

عطیہ سید نے اپنی ابتدائی تعلیم لاہور میں ایک پرائیویٹ سکول میں حاصل کی۔ابتدائی تعلیم کے بارے میں خود کہتی ہیں۔

> "میری امی کی سہلیاں بہت پڑھی لکھی تھیں۔انھوں نے اس زمانے میں ایک پرائیویٹ سکول کھولا تھا جو Co.Education تھا۔ میں نے ابتدائی تعلیم وہاں سے حاصل کی۔ مگر یہ سکول اب موجود نہیں ہے۔"[11]

عطیہ سید نے 1956ء میں انگلش،ہسٹری، جیو گرافی،میتھ،نفسیات اور اُردو کے ساتھ فسٹ ڈویژن میں میٹرک کا امتحان پاس کیا۔[12]

انھوں نے 1958ء میں لاہور کالج برائے خواتین لاہور سے ہسٹری، نفسیات اور اردو کے اختیاری مضامین کے ساتھ ایف اے کا امتحان پاس کیا۔ بعد ازاں اسی کالج سے 1960ء میں فلسفہ، نفسیات اور انگریزی کے مضامین کے ساتھ بی۔اے کا امتحان پاس کیا۔[13] وہ کالج کے زمانے سے ہی ذہین اور قابل طالبہ تھیں۔ زمانہ طالب علمی کے دوران وہ مختلف تعلیمی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لیتی تھیں۔ اپنے کالج میں وہ نہ صرف سوسائٹی کے مضامین کی سیکرٹری رہ چکی ہیں بلکہ کالج کے رسالے "کرن" کی ایڈیٹر، Debating society کی سیکرٹری اور کالج کی یونین سیکرٹری بھی رہیں۔ انھوں نے جی۔سی کالج سے 20 سال کی عمر میں فلسفہ کے مضمون میں ایم۔اے کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد وہاں سے Rule Of Honor بھی اپنے نام کیا۔ وہ گولڈ میڈلسٹ بھی ہیں۔ وہ 1980ء میں فیلوشپ پر امریکہ گئیں۔ باقی تعلیم انھوں نے وہیں سے حاصل کی۔ اصل میں یہیں سے ان کی ادبی زندگی کا آغاز ہوتا ہے۔ حال ہی میں انھوں نے اورئینٹل کالج پنجاب یونی ورسٹی سے فلسفے کے مضمون میں پی۔ایچ۔ڈی مکمل کی ہے۔ عطیہ سید نے بہت سے غیر ملکی اسفار کیے۔ وہ 1980ء میں اعلٰی تعلیم کے لیے نیویارک گئیں۔ اس کے علاوہ مختلف کانفرنسز اور سیمینار میں شرکت کے لیے انھوں نے کابل، ترکی، یونان، اٹلی، سپین، فرانس، جرمنی، یورپ اور روم وغیرہ کا سفر بھی کیا۔

روزگار/ملازمت:

عطیہ سید نے 16 ستمبر 1963ء لاہور کالجمیں پڑھانا شروع کر دیا۔[14] اس وقت ان کی عمر 20 سال تھی۔ اور ایک سال تک پروبیشن رہنے کے بعد انہیں مستقل کر دیا گیا۔ بعد ازاں اسسٹنٹ پروفیسر اور ایسوسی ایٹ کے عہدوں پر فائز رہیں۔ 12 مئی 1999ء کو ان کا تقرر پروفیسر اور صدرِ شعبہ فلاسفی کے طور پر اسی کالج میں ہوا۔[15] ملازمت کے دوران آپ ڈین آف آرٹس، کل پاکستان فلسفہ کانگرس کی نائب صدر اور نیشنل اقبال فورٹ کی صدر کے فرائض سرانجام دیتی رہیں۔ اور 38 سال 8 مہینہ اور 22 دن لاہور کالج میں ملازمت کے بعد 8 جون 2002ء کو ملازمت سے ریٹائر ہونے کے باوجود آپ تعلیمی اور تخلیقی حوالے سے ادب کی خدمات سر انجام دے رہی ہیں۔[16] ریٹائرمنٹ کے بعد وہ مختلف تعلیمی اداروں میں علاّمہ محمد اقبالؒ اور جلال الدین رومیؒ پر

لیکچرز دیتی ہیں۔ ان کو 1897ء میں پاکستان اردو اکیڈمی نے ڈپٹی ڈائریکٹر مقرر کیا۔ وہ اقبال انٹر نیشنل فورم کی صدارت کے ساتھ ساتھ اسلامک فلسفہ فورم کی سیکرٹری بھی رہ چکی ہیں۔ ان کے پاس یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ وہ قائدِ اعظم لائبریری کے تحقیقی مجلّے "مخزن" کی ادارتی کمیٹی کی واحد خاتون رکن بھی رہیں۔ وہ کل پاکستان فلسفہ کانگریس کی سیکشنل صدر کے طویل عرصے تک فرائض بھی سرانجام دے چکی ہیں۔ وہ کل پنجاب آرٹس کونسلز کی انتظامی کمیٹی کی ممبر بھی رہیں۔ علاوہ ازیں وہ پاکستان اقبال اکادمی اور پاکستان اکادمی ادبیات کی مختلف کمیٹیوں کی رکن بھی رہیں۔ وہ اب تک کئی بین الاقوامی کانفرنسوں میں پاکستان کی نمائندگی کر چکی ہیں۔ وہ آج کل گھر میں خوشحال زندگی بسر کر رہی ہیں اور ساتھ ہی انھوں نے مختلف کتابوں پر کام بھی جاری رکھا ہوا ہے۔

شخصیت، عادات واطوار:

عطیہ سید کی شخصیت کا خارجی تاثر بہت ہی شاندار ہے، وہ ایک صاحب علم خاتون ہیں۔ لکھنے پڑھنے کا عمدہ ذوق رکھتی ہیں۔ انھوں نے لکھنے سے قبل تمام تر مشرقی اور مغربی ادب پڑھ رکھا تھا۔ وہ جسمانی اور ذہنی طور پر کافی فعال خاتون ہیں۔ وہ ہر وقت متحرک رہتی ہیں۔ خوش لباس، خوش مزاج اور خوش گفتار ہیں۔ انھیں خوبیوں کی وجہ سے وہ اپنی دوستوں اور تمام تر علمی وادبی حلقوں میں مقبول ہیں۔ ان سب کے ساتھ ساتھ عطیہ سید ایک محنتی اور قابل استاد بھی ہیں۔ وہ مختلف تعلیمی اداروں میں علاّمہ اقبالؒ اور مولانا جلال الدین رومیؒ پر لیکچرز دیتی ہیں۔ عطیہ سید ایک ادیبہ ہونے کے ساتھ ساتھ اعلیٰ انسان بھی ہیں۔ وہ پُر خلوص، تہہ دار پیچیدہ، انسان دوست، اور منفرد فکر وفن کی مالک ہیں۔ وہ امن پسند ہیں۔ انھوں نے اپنی کہانیوں میں ہمیشہ امن کا پیغام دیا۔ وہ دنگا فساد، خون خرابے اور قتل وغارت کے شدید خلاف ہیں۔ وہ ساری دنیا کے انسانوں کو پُر سکون اور خوشگوار زندگی گزارتے ہوئے دیکھنا چاہتی ہیں۔ کشمیر کی موجودہ صورتحال پر بہت دکھ کا اظہار کرتی ہیں۔ اپنے کئی آرٹیکل میں انھوں نے کشمیر کی حالتِ زار کا نقشہ کھینچا ہے۔

"مجھے شروع سے آزادی کی تحریکوں سے محبت رہی ہے یہ میری کمزوری سمجھ لیں۔ میں ان لوگوں میں سے ہوں جن کا دل کشمیر کے ساتھ ہے۔ مجھے بہت افسوس کے ساتھ کہنا پڑھ رہا ہے ہم نے کشمیر کو بھلا دیا ہے۔"[17]

عطیہ سید کا بچپن عام بچوں سے بہت مختلف تھا۔ وہ بچپن سے ہی کتابیں پڑھتی تھیں۔ کھیل کود کا کوئی شوق نہیں تھا۔ عطیہ سید کی والدہ بھی بہت پڑھی لکھی خاتون تھیں انھوں نے آج کل کے پی۔ایچ۔ڈی کے برابر کا ادیب فاضل کیا ہوا تھا۔ ان کی والدہ مطالعہ کی بہت شوقین تھیں۔ انھوں نے تاریخِ اسلام اور تاریخِ ادب کے علاوہ بہت سا ادب پڑھ رکھا تھا۔ وہ فکشن کے علاوہ شاعری کی طرف بھی خاص دلچسپی رکھتی تھیں۔

"میری ادبی نمو میں میرے والدین کا اہم کردار ہے، خاص طور پر میری والدہ کا۔ میری والدہ کتابیں پڑھتی تھیں بچپن میں جب بچہ دیکھتا ہے کہ امی پڑھ رہی ہیں تو وہ بھی پڑھنا شروع کر دیتا ہے وہ حجاب امتیاز علی وغیرہ کو پڑھتی تھیں اور میں ان کے پاس بیٹھ کر بچوں کی کہانیاں پڑھتی تھیں۔"[18]

عطیہ سید کو بچپن سے اپنے خاندان والوں سے بہت محبت ملی۔ وہ کہتی ہیں۔

میرے والدین نے مجھ سے ٹوٹ کر محبت کی تھی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اوّل تو میرے گھر میں لڑکا لڑکی کا کوئی فرق نہیں تھا۔ دوّم یہ کہ دو بیٹوں کے بعد انھیں بیٹی کی شدید خواہش تھی جو کہ اس معاشرے میں عجیب بات ہے۔ اس لیے مجھے بھائیوں جتنا بلکہ ان سے بھی زیادہ پیار ملا۔"[19]

عطیہ سید کے بھائیوں نے بھی عطیہ سید سے بہت محبت کی۔ وہ کہتی ہیں۔

"میں اپنے والدین کا سب سے چھوٹا بچہ تھی۔ دو بڑے بھائی تھے۔ ان میں ایک جلدی فوت ہوگئے۔ دونوں بھائیوں مجھ سے دس سال بڑے تھے۔ وہ مجھے Baby سمجھتے تھے میرے بھائیوں نے مجھے Morally بہت سپورٹ کیا"[20]

عطیہ سید اپنے چچا سے وابستہ یادوں کا ذکر کرتے ہوئے کہتی ہیں۔

"میرے چچا ہمارے ساتھ ہی رہتے تھے مرتے دم تک انھوں نے مجھے اور میرے بھائیوں کو بہت محبت دی۔ خاص طور پر مجھے انھوں نے خاص محبت دی جو انھوں نے اپنے بچوں کو بھی نہیں دی وہ کہتے تھے کہ مجھے تمھاری عادتیں بہت اچھی لگتی ہیں۔"[21]

عطیہ سید کی اپنی چچی کے ساتھ بڑی گہری دوستی تھی اسی دوستی کے سبب سے بچپن میں عطیہ سید کو سیلائی کڑھائی کا بھی شوق پیدا ہوا تھا۔ وہ کہتی ہیں۔

میری چچی پڑھی لکھی خاتون نہیں تھیں پھر بھی میری ان کے ساتھ گہری دوستی تھی۔ وہ بھی مجھ سے بہت محبت کرتی تھیں۔ وہ سلائی کڑھائی کرتی تھیں۔ میں بھی گرمیوں کی چھٹیوں میں ان کے پاس بیٹھ کر سیلائی کڑھائی سیکھتی تھی۔ مگر یہ شوق بچپن کے ساتھ ہی ختم ہو گیا۔"[22]

عطیہ سید کبھی بھی شرارت نہیں کرتی تھیں۔ بچپن سے ان کی طبیعت میں سنجیدگی اور نظم وضبط پایا جاتا تھا، جس کی وجہ سے ان کا پورا خاندان ان سے بے پناہ محبت کرتا تھا۔ امریکہ میں قیام کے دوران عطیہ سید کو کھانا پکانے کے تجربے سے بھی گزرنا پڑا۔

"مجھے کھانا پکانے کا شوق نہیں تھا مگر جب میں امریکہ گئی تو وہاں مجھے بہت دقت محسوس ہوئی کیونکہ میں ہر وقت وہاں کا کھانا نہیں کھا سکتی تھی۔ وہاں کھانا پکانا سیکھا مگر مجبوری میں۔"[23]

عطیہ سید اپنے والدین کی اکلوتی بیٹی تھیں۔ ان کی کوئی بہن نہیں تھی۔ انھوں نے اپنی بہن کی کمی کبھی محسوس نہیں کی۔

"میں نے کبھی بہن کی کمی محسوس نہیں کی۔ یہ میری طبیعت سمجھ لیں یا اللہ کا کرم سمجھیں کہ مجھے آج تک کبھی کسی چیز کی کمی محسوس نہیں ہوئی۔"[24]

عطیہ سید کا خواب تھا کہ وہ فارن سروس میں جائیں مگر اس وقت لڑکیوں کو اتنی آزادی نہیں تھی کہ وہ اس شعبے میں جاسکیں۔ لہذا ان کا خواب پورا نہ ہو سکا۔ اس بارے میں وہ ایک انٹرویو میں کہتی ہیں:

"میں فارن سروس میں جانا چاہتی تھی لیکن اس وقت لڑکیوں کو اجازت نہیں تھی۔ اب جو Morale لڑکیوں کو حاصل ہیں وہ میرے زمانے کی لڑکی کو حاصل نہیں تھے۔ چونکہ مجھے دیس بدیس پھرنے کا شوق تھا۔ پھر سارے ادب بھی میں نے پڑھے ہوئے تھے خاص کر یورپ کا ادب میں نے سارا پڑھ رکھا تھا۔۔۔ بہر حال میرا یہ خواب پورا نہ ہو سکا۔"[25]

عطیہ سید ایک ادیبہ ہونے کے ساتھ ساتھ ایک اعلیٰ انسان بھی ہیں۔ وہ جب بھی کسی مسئلے پر بات کرتی ہیں تو صاف گوئی کا روّیہ اختیار کرتی ہیں۔ وہ سوشل میڈیا سے دور رہتی ہیں۔ وہ فقر پسند شخصیت ہیں۔ وہ خود کہتی ہیں کہ فلسفی بے نیاز ہوتے ہیں، اس لیے مختلف موقعوں پر ملنے والے تمغوں نے انھیں غرور اور تکبر میں مبتلا نہیں کیا بلکہ انھیں خوشی ہوئی۔ عطیہ سید عطیہ سیدوں کے بارے میں پُر امید ہیں۔ ان کے خیال میں خواتین بھی افسانہ نگاری کے میدان میں اچھے تجربے کر رہی ہیں۔

عطیہ سید سیر و سفر کی شوقین ہیں۔ 1980ء میں فیلوشپ پر امریکہ گئیں۔ وہاں انھوں نے نیویارک میں قیام کیا۔ وہ امریکہ کے علاوہ کئی دوسرے ممالک کی سیاحت کر چکی ہیں۔ انھوں نے اپنے ادوار سے حاصل ہونے والے مشاہدات کو اپنی تخلیقات میں برتا۔ یہی وجہ ہے کی ان کے ہاں غیر ملکی معاشرت کی تصاویر جابجا دکھائی دیتی ہے۔

عطیہ سید نے پُر سکون اور خوشحال زندگی گزاری۔ وہ اپنے انداز و اطوار میں عاجزی وانکساری رکھتی ہیں۔ وہ کسی بھی ادیب سے بہت کم متاثر ہوتی ہیں۔ انھوں نے کسی ادیب کے رنگ کو اپنا رنگ نہیں بنایا بلکہ ہمیشہ سب سے الگ، اچھوتا اور نیا اندازِ تحریر اختیار کیا۔ مگر بعض ادیبوں کو وہ بڑا ایب سمجھتی ہیں مثلاً "سعادت حسن منٹو" اور اس کے علاوہ وہ "دوستوفسکی" سے بھی متاثر ہیں۔

"میں ابھی تک کسی بھی ادیب سے متاثر نہیں ہوئی۔ یہ ایک میری انفرادیت ہے۔ یہ میری بچپن کی عادت ہے۔ میں اکثریت سے بہت مختلف انسان ہوں۔ میں نے بہت بڑی اور عظیم شخصیتوں کو بچپن سے دیکھا ہے۔ان کے مقابلے میری نظر میں آج کل کا ادب جچتا نہیں ہے۔"[26]

اسی حوالے سے وہ مزید کہتی ہیں۔

"خالدہ حسین میرے بارے میں مضمون لکھنا چاہتی تھیں۔اس سے قبل میری ان سے ذاتی ملاقات ہوئی جس میں انھوں نے مجھ سے کہا کہ "تمہارے بارے میں لکھتے ہوئے مجھے بہت دقت محسوس ہو رہی ہے۔ مجھے سمجھ نہیں آ رہی کہ میں لکھوں تو کہاں سے لکھوں کیونکہ تمہارا کوئی سرا مجھ سے پکڑا نہیں جارہا۔" اگر میں نے کسی سے متاثر ہو کر لکھا ہوتا تو انھیں فوراً سمجھ آجاتی کہ میں نے فلاں ادیب کے زیرِاثر لکھا ہے۔"[27]

ادبی سفر:

اُردو ادب میں عطیہ سید کی مختلف حیثیتیں ہیں۔ وہ افسانہ نگار ہونے کے ساتھ ساتھ ناول نگار، مفکر، کالم نگار، ماہرِاقبالیات، مترجم اور استاد بھی ہیں۔ تاہم ان کی اصل حیثیت ایک بے مثل افسانہ نگار کی ہے۔انھوں نے اپنے افسانوی سفر کا آغاز 1987ء میں کیا۔ اور اپنا پہلا افسانہ "کرسمس کی شب" رسالہ "فنون" میں احمد ندیم قاسمی کے توسط سے شائع کیا۔اپنے پہلے افسانے کے آغاز کے بارے میں عطیہ سید لکھتی ہیں:

"شاید میرا افسانہ لکھنے کا آغاز ایک ایسی ہی گنجلک کہانی ہے۔بظاہر میری زندگی کا یہ اہم حادثہ 1987ء کو پیش آیا"28

عطیہ سید امریکہ میں رہائش پذیر تھیں۔ جب انھوں نے امریکن طرزِ زندگی کا بغور مطالعہ کیا۔وہاں کے باشندوں کی بے بسی، بے حسی، مجبوری اور خود پسندی کو اپنی آنکھوں سے دیکھا۔اس سفر نے عطیہ سید کی فکر وسوچ کے دائرے کو وسیع کیا۔ عطیہ سید چھٹیاں گزارنے پاکستان آئیں۔ انھیں رات دیر تک جاگنے کی عادت

تھی۔اس وقت ضیاالحق کا زمانہ تھا اور PTV نو بجے اپنی نشریات بند کر دیتا تھا۔عطیہ سید نے بوریت سے بچنے کے لیے افسانہ لکھنے کا سوچا۔اپنے پہلے افسانے کے آغاز سے متعلق مزید ایک جگہ لکھتی ہیں:

"ایک رات سب اہلِ خانہ اپنے اپنے کمروں میں جا چکے تھے اور میں بھی بادل نخواستہ اپنے کمرے کی طرف جا رہی تھی کہ اچانک بجلی کے کوندے کی طرح یہ خیال ذہن میں لہرایا کہ کیوں نہ افسانہ لکھا جائے۔اس خیال کے آتے ہی تازگی کا احساس ہوا اور بوریت سے بوجھل جسم میں مسرت و انبساط کی لہر سی دوڑ گئی۔میں نے رائیٹنگ ٹیبل پر رکھا لیمپ روشن کیا حیرت اس بات کی ہے کہ مجھے موضوع چننے یا اس کے بارے سوچنے کی ضرورت پیش نہیں آئی چھوٹتے ہی میں افسانے کا عنوان "کرسمس کی شب" لکھا۔ پھر یوں الفاظ و تصورات ذہن میں جمگھٹ ہونے لگے جیسے کسی صحن میں کبوتر جوق در جوق اور غول در غول اترنے لگے ہوں"29

عطیہ سید کی والدہ بھی پڑھی لکھی خاتون تھیں۔اس لیے انھوں نے افسانہ مکمل کرنے کے بعد اپنی والدہ کو سنایا۔ان کی والدہ نے افسانہ سننے کے بعد کہا:

"۔۔۔خوب تمھارے افسانے نے مجھے پوری طرح اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔یوں لگتا تھا کہ میں خود کہانی کے اندر موجود ہوں۔سارا ماحول مجھ پر اس قدر چھا گیا تھا۔"30

عطیہ سید نے والدہ کے تبصرے کو زیادہ اہمیت نہ دی مگر بعد ازاں والدہ کے مشورے سے احمد ندیم قاسمی کو دکھانے کا ارادہ کیا۔احمد ندیم قاسمی اس وقت رسالہ "فنون" کے ایڈیٹر تھے۔انھوں نے افسانہ پڑھنے کے بعد کہا:

"آپ نے بہت اچھا لکھا۔لگتا نہیں کہ آپ نے پہلی مرتبہ افسانہ لکھا ہے"[31]

اس طرح عطیہ سید کا پہلا افسانہ رسالہ "فنون" میں چھپ گیا۔ دوستوں واحباب اور قارئین سے ملنے والی داد نے عطیہ سید میں مزید لکھنے کا شوق پیدا کیا اور اس کے بعد انھوں نے دوسرا افسانہ "شہرِ ہول" لکھا۔ جو کہ چھ مہینے میں مکمل ہوا۔ اس کے بعد تیسرا افسانہ "ہوٹل سلازار" لکھا۔ یوں عطیہ سید نے یکے بعد دیگرے کئی افسانے لکھے۔ عطیہ سید کا تعلق ادبی گھرانے سے ہے۔ وہ ادبی ماحول میں پلی بڑھی، اس کے باوجود انھوں نے لکھنا بہت بعد میں شروع کیا۔ اس کی وجہ وہ خود بتاتی ہیں:

"۔۔۔آجی کی علالت وفات سے بہت پہلے ہی میرے صحرائے باطن میں ادبی تخلیق کی خواہش سرسرا رہی تھی۔ پھر کیوں تخلیق کے سوتے کو پھوٹنے میں، سنگ خارا کی چٹانوں کو گلنار کرنے میں اتنے برس لگے؟ اس کا ایک جواب بائبل میں تحریر ہے۔ ہر چیز کا ایک وقت مقرر ہے۔۔۔بیج بونے کا اور فصل کاٹنے کا بھی، ہنسنے کا بھی اور رونے کا بھی، وصل اور فراق، زندگی اور موت دونوں کا سو شاید تخلیق کا بیج بھی ایک امکان کی طرح میرے باطن میں کہیں موجود تھا، لیکن اس کے پھلنے پھولنے کا ایک وقت تھا۔۔۔اور وہ وقت تھا اپریل 1987ء جب تخلیق کی دیوی شعور کے سمندروں سے اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ ابھری۔"32

عطیہ سید کو کہانی لکھنے کے لیے کسی استاد یا راہنما کی ضرورت نہیں پڑی کیونکہ ان کا حسب و نسب اعلیٰ تعلیمی قدروں کا پروردہ تھا۔ ان کے بزرگوں کا ذہن علم کی روشنی سے پوری طرح بیدار تھا۔ عطیہ سید کے والد ڈاکٹر سید عبداللہ معروف عالم، ادیب، شاعر، دانش ور اور استاد تھے۔ عطیہ سید کی دادی بھی عمدہ شعری ذوق رکھتی تھیں۔ اس کے علاوہ انھیں فارسی زبان پر دسترس حاصل تھی۔ ان کے دادا کو عربی زبان سے بے حد لگاؤ تھا۔ جو اپنے وقت کے عالمِ دین بھی تھے، مگر انھوں نے اپنی حکمت کو کبھی روپیہ پیسہ کمانے کا زریعہ نہیں بنایا۔ عطیہ سید کی والدہ بھی پڑھی لکھی خاتون تھیں۔ وہ ماہ نامہ "دہلی" میں آرٹیکل بھی لکھا کرتی تھیں۔ عطیہ سید

کے بھائی سید سجاد بھی شاعری کرتے تھے۔ان کی شاعری کے دو مجموعے بھی منظرِ عام پر آچکے ہیں۔اس سارے پس منظر سے یہ واضح ہوتا ہے کہ عطیہ سید نے ایک ادبی گھرانے میں جنم لیا،اس صورت میں ان کا ایک تخلیق کار بننا فطری بات تھی۔

اعزازات:

1۔عطیہ سید کے پہلے مجموعہ "شہرِ ہول" کو 1995ء میں ہیر لڈ (کراچی) نے "Favorite fiction of the year" قرار دیا۔شہر ہول کا دوسرا ایڈیشن "خزاں میں کونپل" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔

2۔2015ء استنبول یونیورسٹی (ترکی) سے "Life Long Achievement Award" ایوارڈ بھی حاصل کر چکی ہیں۔اسوقت یہ اعزاز صرف دو اسکالرز کو حاصل ہوا۔ایک ماسکو یونیورسٹی کی پروفیسر لڈ ملا اور دوسری پاکستان کی عطیہ سید کو۔یہ بذاتِ خود پاکستان کے لیے بھی فخر کی بات ہے۔

3۔2016ء میں عطیہ سید کو ادب کے شعبے میں خصوصاً فکشن میں خدمات سر انجام دینے پر حکومت پاکستان نے تمغہ امتیاز سے نوازا۔

عطیہ سید نے اُردو ادب میں جتنی گراں قدر خدمات سر انجام دی ہیں۔ان کے اعترافات میں یہ اعزازات کم تر درجے کے حامل ہیں۔انھوں نے اُردو ادب کو وہ سر خروئی عطا کی ہے جس کی وجہ سے ہمارا ادب عالمی ادب کے مد مقابل ہو گیا ہے۔

تصانیف

عطیہ سید کی تخلیقات کی تعداد بہت طویل نہیں ہے۔مگر اس کے باوجود ان کی تخلیقات اُردو ادب میں ایک قیمتی سرمایہ ہیں۔انھوں نے اب تک تین افسانوی مجموعے اور ایک ناول لکھا ہے۔علاوہ ازیں انھوں نے بہت سی انگریزی کتب کے تراجم بھی کیے ہیں۔انھوں نے کئی فلفیانہ کتب لکھ کر بھی فلسفے کے شعبے میں گراں

قدر خدمات سرانجام دی ہیں۔انھوں نے علامہ اقبالؒ پر ایک فلسفی کی حیثیت سے بہت سا کام کیا ہے۔ عطیہ سید کا شمار ان لوگوں میں ہوتا ہے جنھوں نے بہت کم لکھا مگر جو لکھا وہ معیاری ہے۔

"میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جن کی پچاس کتابیں شائع ہو جائیں۔ میں نے بہت کم لکھا ہے مگر جو بھی لکھا ہے وہ دل سے لکھا ہے۔"33

عطیہ سید کی تخلیقات کی تفصیل درج ذیل ہے:

افسانوی مجموعے

خزاں میں کونپل (شہرِ ہول)

عطیہ سید کا پہلا مجموعہ "شہرِ ہول" ہے جس کا پہلا ایڈیشن 1995ء میں منظرِ عام پر آیا۔ اسے سنگِ میل پبلی کیشنز نے شائع کیا۔ "شہرِ ہول" کا دوسرا ایڈیشن "خزاں میں کونپل (شہرِ ہول)" کے نام سے 2004ء میں شائع ہوا۔ اس کو بھی سنگِ میل پبلی کیشنز نے ہی شائع کیا ہے۔اس مجموعے میں کل پندرہ افسانے ہیں اور 248 صفحات ہیں۔ یہ افسانوی مجموعہ عطیہ سید نے اپنے والد ڈاکٹر سید عبداللہ کے نام کیا اس افسانوی مجموعے کا پیش لفظ "افتخار جالب" نے انتہائی خوبصورت انداز میں لکھا ہے۔اس کے بعد عطیہ سید نے اپنے پہلے افسانے کے آغاز کے بارے میں "کہانیوں کی کہانی" کے عنوان سے تفصیل سے لکھا ہے۔اس مجموعے میں شامل پندرہ افسانوں کی ترتیب یہ ہے:

1۔ کرسمس کی شب 2۔ شہرِ ہول 3۔ پریزاد 4۔ ہوٹل سلازار 5۔ میری میرا 6۔ چھ بجے کی خبر 7۔ خزاں میں کونپل 8۔ بنتِ اسرائیل 9۔ کرپکے اور چینی کمرہ 10۔ ایبل اور وہ 11۔ آخری کہانی 12۔ آنسو کا نمک 13۔ شمالی ستارہ 14۔ عشقِ تمام 15۔ برگزیدہ

لفظ "شہرِ ہول" اپنے اندر گہری معنویت لیے ہوئے ہے۔ "شہرِ ہول" امریکی زندگی کا استعارہ ہے۔ کیونکہ اس مجموعے کی زیادہ تر کہانیاں امریکن طرزِ زندگی کی نفسیاتی اور روحانی مسائل کی عکاسی کرتی

ہیں۔ کردار سفید فام، حبشی، عیسائی، ہندو اور پاکستانی ہیں۔ "صفدر میر "اس مجموعہ کو اپنے ایک انگریزی مضمون میں Bewirhting tale of a deadful city قرار دیا اس مجموعے کو عطیہ سید کے گہری مشاہدے اور بصیرت کا عکس قرار دیا جا سکتا ہے۔ اسی مجموعے کو ہیر لڈ (کراچی) نے favorite fiction of the year قرار دیا۔

حکایاتِ جنوں

عطیہ سید کا دوسرا مجموعہ "حکایاتِ جنوں" جو 2001ء میں منظرِ عام پر آیا۔ جس کو سنگِ میل پبلی کیشنز نے شائع کیا۔ اس مجموعے میں بھی کل پندرہ افسانے ہیں۔ اور 174 صفحات ہیں۔ یہ افسانوی مجموعہ عطیہ سید نے اپنے بھائی سید سجاد حیدر کے نام کرتے ہوئے کہا کہ "اپنے بھائی سید سجاد کے نام، جنھوں نے میرے لیے بین الاقوامی ادب کے دریچے وا کیے۔" اس افسانوی مجموعے کا پیش لفظ "عطیہ سید نے انتہائی خوبصورت انداز میں خود لکھا ہے۔ اس مجموعہ کی کہانیوں کی ترتیب یہ ہے:

1۔ رقص 2۔ چھپکلی 3۔ اُڑتا پرندہ اور سنہری مچھلی 4۔ درویشِ رقصاں 5۔ جلوہ 6۔ عکس 7۔ دائرہ 8۔ دخترِ شب 9۔ تحیرِ عشق 10۔ فریبِ آرزو 11۔ تعطل کے بعد 12۔ حکایتِ خونچکاں 13۔ مٹھی میں بند لمحہ 14۔ ابھی نسترن کے پھول کھلے نہیں 15۔ نوحہ

بقول ڈاکٹر اے بی اشرف:

> "حکایاتِ جنوں پڑھ کر جو فوری تاثر اُبھرا وہ ان کہانیوں میں دلچسپی کے عنصر کا تھا۔ یعنی یہ کہانیاں اس دلچسپی اور کہانی پن کے عنصر سے بھرپور ہیں جو کسی بھی کہانی کی بنیاد بنتا ہے۔"[34]

غلام حسین ساجد نے عطیہ سید کے افسانوی مجموعے "حکایاتِ جنوں" پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا۔

"۔۔۔رقص سے نوحہ تک تمام افسانوں میں مشترک شے رنگِ
جنوں ہے جو رنگ بدل بدل کر ظاہر ہوتا ہے۔اور موجود پر غالب
آجاتا ہے۔"[35]

آگے چل کر غلام حسین ساجد اسی مجموعے کے اسلوب کے بارے میں مزید لکھتے ہیں۔

"عطیہ سید نے ایک ماہر مرصع ساز کی طرح برجستگی اور زبان کی موزوں ترین تمثالوں کو برت کر ان افسانوں کی تاثیر اور قدر کو بڑھا دیا ہے۔سچ یہ ہے کہ ان کا بیانیہ، کہانی کا پھیلاؤ اور پھر انجام کی طرف فطری گریز اور جنوں کی کیفیت کو کشف کی سی معصوم ادا کے ساتھ اجاگر کرنے کا سلیقہ۔۔۔سب مل کر ایک ہی بات کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ عطیہ سید کو افسانہ لکھنے کا ہنر آتا ہے۔"[36]

دشت، بارش اور رات

عطیہ سید کا تیسرا مجموعہ "دشت، بارش اور رات" 2013ء میں منظرِ عام پر آیا۔ جس کو دستاویز لاہور نے شائع کیا۔اس مجموعے میں بھی کل انیس افسانے ہیں۔اور 224 صفحات ہیں۔یہ افسانوی مجموعہ عطیہ سید نے اپنی والدہ بی بی حوا کی اور اپنی دوست افشین کے نام کیا ہے۔اس افسانوی مجموعے کا پیش لفظ "عطیہ سید نے "کہانی زندگانی" بہت خوبصورت انداز میں خود لکھا ہے۔اس مجموعہ کی کہانیوں کی ترتیب یہ ہے:

1۔ڈھلوان 2۔ بلقیان کا بت 3۔دہلیز 4۔ڈان کارلوس 5۔ سبز اندھیرا 6۔ تتلی 7۔ پچھل پائی 8۔ خاموشی 9۔ طلسمِ دل رُبا 10۔"ہمیں قتل ہو آئیں یاروں چلو" 11۔واپسی 12۔ذکر اُس پری وش کا 13۔دو چڑیاں 14 شہزادہ اور نیک بخت 15۔ بیلا روما 16 دشت، بارش اور رات 17۔سدھارتھ اور گوتم بدھ 18۔ ایک عام معمولی آدمی 19۔آ جی

ناول

"غبار"

عطیہ سید کا ناول "غبار 1997ء میں منظرِ عام پر آیا اس کا دوسرا ایڈیشن "2012ء میں منظرِ عام پر آیا۔ جس کو سنگِ میل پبلی کیشنز نے شائع کیا۔ یہ ناول 144 صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ ایک نفساتی اور جنسی مطالعہ ہے۔ "غبار" میں ایک پاکستانی گھریلو کہانی بیان کی گئی ہے۔ یہ ناول ایک نفسیاتی مطالعہ ہے۔ یہ موضوع کے لحاظ سے ایک منفرد ناول ہے۔ یہ ایک ایسے گھرانے کی کہانی ہے۔ جن کا باپ ان کو چھوڑ کر باہر کے ملک چلا جاتا ہے۔ اور ایک پاکستانی لڑکی سے شادی کر لیتا ہے۔ یہاں ان کے بچے باپ کے چلے جانے کے بعد ذہنی ااور نفسیاتی مسائل الجھنوں کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ڈاکٹر سلیم ارحمٰن نے لندن سے شائع ہونے والے انگریزی اخبار "The News" میں اس ناول کو نوجوانوں کی نفسیاتی الجھنوں اور ذہنی کیفیات کی ترجمانی قرار دیا ہے۔ یہ ناول نوجوانوں کے جنسی اور نفسیاتی مسائل پر عطیہ سید کی ایک کامیاب کوشش ہے۔

عطیہ سید کا دوسرا ناول بھی زیرِ اشاعت ہے۔

فلسفیانہ کتب

اقبال۔ مسلم فکر کا ارتقا

یہ کتاب 1994ء میں منظرِ عام پر آئی۔ اس کے اب تک دو ایڈیشن سامنے آچکے ہیں۔ اس کتاب میں علامہ اقبال کے افکار کو مسلم مفکرین کی فلسفیانہ روایت کے پس منظر میں سمیٹنے کی کوشش کی گئی ہے۔ عطیہ سید کی پہلی کتاب "اقبال — مسلم فکر کا ارتقا" پانچ حصّوں اور چودہ ابواب پر مشتمل ہے۔

حصّہ اوّل بعنوان "یونانی فلسفہ" ہے جبکہ حصّہ دوّم میں بعنوان "متکلمین" میں دو ابواب بلترتیب "معتزلہ" اور "اشاعرہ" ہیں۔ حصّہ سوّم "تصوف اور صوفیا" کے عنوان پر مشتمل ہے جس میں دو ابواب "تصوف" اور "صوفیا اور مابعد الطبیعات" موجود ہیں۔ حصّہ چہارم میں چار ابواب بالترتیب "ابنِ مسکویہ"، "ابنِ سینا"، "الغزالی" اور "ابنِ رشد" شامل ہیں۔ حصّہ پنجم میں پانچ ابواب "البیرونی"، "عراقی"، "ابنِ تیمیہ"، "ابنِ خلدون" اور "حاصلِ بحث" شامل ہیں۔

صفدر میر اور انتظار حسین نے اس کتاب کے حوالے سے کئی انگریزی اخباروں میں جائزے پیش کیے۔ "خان سماب" عطیہ سید کی اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

> "عطیہ سید کی اسلامی علم الکلام پر فلسفیانہ مباحث کی صورت میں اقبال کے نقطہ نظر کو مد نظر رکھتے ہوئے ایک مدلل کتاب ہے۔۔۔۔ جو اقبال کے اُس عمومی رویے کی غمازی کرتی ہے جو کہ اقبال نے یونانی فلسفے کی بابت اختیار کیا۔"[37]

فلسفیانہ مطالعات

یہ کتاب مشہور مفکرین کے افکار کے مختلف پہلوؤں پر تحقیقی مقالے ہیں۔ یہ کتاب عطیہ سید ان مقالہ جات کا مجموعہ ہے جو انھوں نے نیویارک یونیورسٹی میں رہ کر ریسرچ کے دوران تخلیق کیے۔ نیویارک یونیورسٹی

میں انھوں نے یہ ریسرچ انگریزی میں کی تھی۔ مگر بعد میں انھوں نے پاکستان کے لوگوں کے استفادے کی خاطر ان انگریزی مضامین کا ترجمہ اُردو میں کیا جس کو انھوں نے "فلسفیانہ مطالعات" کا نام دیا۔اس ترجمے کے دوران انھوں کئی انگریزی اصطلاحات اُردو میں اختراع کیں۔ کئی انگریزی اصطلاحات کو اُردو میں منتقل کرنا عطیہ سید کی دیگر کئی خدمات میں سے ایک مفید خدمت ہے۔اس کتاب کے دو ایڈیشن منظرِ عام پر آچکے ہیں۔ دوسرا ایڈیشن 2015ء میں سامنے آیا

ادراکات

یہ کتاب 2015ء میں شائع ہوئی۔ یہ تنقیدی، ادبی اور سماجی مسائل کا مجموعہ ہے اس کتاب میں امن کے فقدان اور حالات کی سنگینی سے متعلق سماجی تجزیہ کیا گیا ہے۔اس میں ایسے بہت سے سوالوں کے جوابات ملتے ہیں جس کے بارے میں انسان سوچتا ہے۔ مثلاً عالمگیریت یعنی Globalization سے ہماری زبان پر کیا اثرات مرتب ہوتے ہیں؟ ہماری تہذیب کو کیا کیا خطرات در پیش ہو سکتے ہیں؟ مرزا ادیب اور کئی دوسرے ادیبوں کی کتابوں کا تجزیہ بھی شامل ہے المختصر اس کتاب میں ہر قسم کے لسانی، سماجی اور ادبی موضوعات ملتے ہیں۔

انگریزی کتب

1. Iqbal's Guidelines For Character Building Social Development(2001)

2. Sadra Rumi and Modren Thikers(زیرِاشاعت)

3. The Comparative Studies (Sadra, Rumi and Iqbal) (زیرِاشاعت)

تراجم

دریا کنارے (ہرمن ہیسے کے ناول "سدھارتھا" کا ترجمہ)

یہ کتاب نوبل انعام یافتہ ادیب ہرمن ہیسے کے مشہور ناول "سدھارتھ" کا ترجمہ ہے، جو 2016ء میں منظرِ عام پر آیا۔ اس سے پہلے بھی اس کتاب کے دو تراجم سامنے آ چکے تھے۔ ایک انڈیا سے یعقوب یاور نے اور دوسرا پاکستان سے ڈاکٹر آصف اسلم فرخی نے کیا۔ عطیہ سید نے اس کا نام "دریا کنارے" اس ناول کے مجموعی تاثر کو سامنے رکھتے ہوئے رکھا۔ ہرمن ہیسے کو جس ناول پر نوبل پرائز ملا وہ ناول اتنا مقبول نہیں ہوا جتنا یہ ناول ۔عطیہ سید نے اس کتاب کے آخر میں مصنف کی حالاتِ زندگی اور افکار پر تحقیقی و تنقیدی تجزیہ بھی پیش کیا ہے۔ چونکہ یہ ایک فلسفیانہ ناول ہے۔ اور عطیہ سید خود بھی فلسفی ہیں۔ اس لیے عطیہ سید کا اس ناول کی طرف رجحان فطری بات تھی۔ عطیہ سید س کتاب کے حوالے سے کہتی ہیں۔

> "۔۔۔۔اس کا بیانیہ دھوپ میں چمکتی دمکتی دریائی لہروں کی مانند دلکش اور کسی سریلے پرندے کے گیت کی طرح دل موہ لیتا ہے اس لیے ناقدین مغرب نے اس کی نثر کو بائبل کی زبان کی طرح سہل اور حسین قرار دیا ہے۔"[38]

مشہور ادیب "ڈاکٹر عامر سہیل" عطیہ سید کی کتاب "دریا کنارے" کے ترجمے پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

> "۔۔۔۔"دریا کنارے" کا ترجمہ ناول کی پڑھت میں سہولت اور خوبصورتی پیدا کرتا ہے۔ کسی مقام پر یہ گمان نہیں ہوتا کہ ہم ترجمہ شدہ متن پڑھ رہے ہیں۔ عطیہ سید نے ترجمے کی زبان اور اسلوب کو ممکنہ حد تک تخلیقی پیٹرن کے قریب رکھا

ہے۔ یہ ناول پڑھ کر میں ایک بار پھر سرشاری اور وجدانی کی کیفیات سے ہمکنار ہوا
ہوں۔ عطیہ سید کا یہ ترجمہ اُردو ادب میں ایک اہم اضافہ ہے۔"39

عقیل روبی لکھتے ہیں۔

"عطیہ سید کا اسلوب دلچسپ ہے۔ زبان اور کرافٹ ایک خوبصورت مرقع تیار کرتا ہے۔ یہ ترجمہ اس بات کا ثبوت ہے جو کولرج کہا کرتا تھا Propor word in proper place عطیہ سید نے کولرج کی اس بات کو ثابت کر دکھایا ہے"

سفر نامہ

دشت بارش اور رات

یہ ایران کا سفر نامہ ہے۔ جو انتہائی دلچسپ حقائق و واقعات اور معلومات پر مبنی سفر نامہ ہے۔ یہ سفر نامہ خوب صورت عبارت اور دلکش مناظر سے پُر ہے۔ ہلکے پھلکے طنز و مزاح کے عنصر نے اس سفر نامے کی خوب صورتی میں مزید اضافہ کر دیا ہے۔ اس سفر نامے کی 15 قسطیں ہیں۔ ہر قسط کا ایک الگ نام ہے جو الحمرا رسالے میں شائع ہوئیں۔

ترکی کا سفر نامہ (زیرِاشاعت)

ذہنی ارتقا

خاندانی پس منظر

عطیہ سید کا گھرانہ ادبی ذوق کا حامل تھا۔ عطیہ سید کی والدہ پڑھی لکھی خاتون تھیں۔ عطیہ سید کے نانا تعلیم کو بہت اہمیت دیتے تھے۔ وہ خود بھی علی گڑھ سے پڑھ کر آئے تھے۔ انھوں نے گھر میں ادبی رسالے بھی

لگوائے ہوئے تھے۔ وہ شروع سے مطالعہ کی شوقین تھیں۔ علمی وادبی طرف وہ شادی کے بعد آئیں۔ آپ کے والد شعر وادب کا خاصا ذوق رکھتے تھے۔ وہ عطیہ سید سے بہت محبت کرتے تھے۔ وہ جہاں بھی جاتے عطیہ سید کو اپنے ساتھ لے کر جاتے تھے۔ عطیہ سید کہتی ہیں۔

"میری زیادہ دوستی اپنے والدین سے رہی ہے۔ میں اپنے والد سے بچپن سے علمی و ادبی باتوں پر بہت بحث کرتی تھی۔ وہ کبھی برا نہیں مناتے تھے۔ انھوں نے میرا نام علامہ تبریزی رکھا ہوا تھا۔ وہ کہتے تھے کہ "اس نے نہیں ماننا جو مرضی کہہ لو۔ یہ ہر بات میں آگے سے حجت پیش کرتی ہے۔" یہ ان کی محبت تھی ورنہ اس دور کے والدین بہت سخت ہوا کرتے تھے"40

عطیہ سید سے انھیں والہانہ لگاؤ تھا۔ وہ بچپن میں Nursery Rhyme کی جگہ عطیہ سید کو اشعار سنایا کرتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ عطیہ سید کا رجحان شاعری کی طرف ہو۔ مگر عطیہ سید کا رجحان نثر کی طرف زیادہ تھا۔ "سعادت حسن منٹو" کی طرح وہ خود کو ایک نثری خاتون کہتی ہیں۔ اس حوالے سے وہ اپنے ایک انٹرویو میں کہتی ہیں:

"میرا بچپن عام بچوں سے بہت مختلف تھا۔ شروع میں ڈائری لکھتی تھی۔ شروع سے میں ناول پڑھتی تھی۔ شاعری کا شوق میرے والدین کو ضرور تھا۔ میری والدہ بہت پڑھی لکھی خاتون تھیں۔ میرے والد کو بھی شاعری کا بڑا ذوق تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ مجھ میں شاعری کا ذوق پیدا ہو، چنانچہ وہ بچپن سے مجھے بجائے Nursery Rhyme یا اور کوئی ایسی نظمیں سکھانے کے انھوں نے مجھے "میر تقی میر" کا "پتا پتا بوٹا بوٹا حال ہمارا جانے ہے" سنایا۔۔۔ لیکن اس کے باوجود میں اتنی نثری خاتون ہوں کہ میں شاعرہ نہیں بنی۔"41

مگر ان سب کے باوجود عطیہ سید نے اپنے بعض افسانوں میں کئی اشعار بھی کہے۔ شاعری کے چند ایک نمونے ملاحظہ کیجیے:

"میں نے اسے تلاش کیا ہے۔

گہرے جنگلوں کی گھنی چپ میں،

بہتے سبز پانیوں میں،

آسمانوں کی کھلی نیلی چھتریوں میں،

تنگ و تاریک گلیوں میں، بھرے کوچوں میں،

میلے کچیلے، راندہ درگاہ لوگوں میں،

مگر ابھی تک میں نے نہیں سنی،

کسی کرشن کی ہنسی، کسی جبریل کے پروں کی سرسراہٹ،

کسی عیسیٰ علیہ السلام کی آمد کی نوید،

کسی محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قدموں کی آہٹ۔"42

اسی طرح ایک اور مقام پر دیکھیے:

"نجانے کیوں جلا دیتے ہو انجانی خواہش کے الاؤ

جن میں دن رات چٹختی ہیں میری ہڈیاں،

اور تم مسکراتے رہتے ہو

مجھے آتشِ نمرود میں جلا کے تم گنگناتے رہتے ہو

میں تن دریدہ، پیراہن بریدہ

کھڑی ہوں، اکیلی دشت بلا میں،

اور مسکراتے رہتے ہو، گنگناتے رہتے ہو

میں کہ صلیب بھی ہوں اور مصلوب بھی،

تم کہ نہ مسیحا ہو نہ شافی،

میری سر بریدہ لاش سے ٹپکتے لہو کے قطروں کو اپنے پاؤں کی مٹی نہ سمجھو کہ

میں بر گزیدہ ہوں،

اور تم نہ مسیحا ہو نہ شافی۔"43

عطیہ سید کے دادا عالمِ دین اور طبیب کی حیثیت سے بھی مشہور تھے۔ لیکن ان کی طبیعت اور مزاج ایسا تھا کہ انھوں نے کبھی بھی اپنی حکمت کو روپیہ پیسہ کمانے کا ذریعہ نہیں بنایا۔ اپنے علاقے کے علاوہ وہ دور دراز کے علاقوں تک لوگوں کے گھر جا کر ان کا مفت علاج کیا کرتے تھے۔ وہ وہاں "طبیب میاں" کے نام سے پکارے جاتے تھے۔ عطیہ سید کا تعلق ادبی گھرانے سے ہے عطیہ سید کے دو بھائی تھے۔ مگر ایک بھائی جلدی انتقال کر گئے۔ دوسرے بھائی سید سجاد حیدر ہیں۔ جنھوں نے ہمیشہ عطیہ سید کا ہر موقع پر بہت ساتھ دیا۔ عطیہ سید کے بھائی سید سجاد حیدر کو شاعری اور فلسفے سے بہت لگاؤ تھا۔ ان کی جدید شاعری کے دو مجموعے بھی شائع ہو چکے ہیں۔ سید سجاد شاعری کرنے کے ساتھ ساتھ اڈووکیٹ بھی تھے۔ عطیہ سید اپنے بھائی کے مشورے پر ترجمہ نگاری کی طرف آئیں۔

عطیہ سید کی والدہ بھی پڑھی لکھی خاتون تھیں۔ انھوں نے عطیہ سید کی زندگی میں بہت اہم کردار ادا کیا۔ وہ خود بھی ایک استانی تھیں۔ وہ "ساقی" (دہلی) میں آرٹیکل لکھتی تھیں۔ وہ بہت سی کتابوں کا مطالعہ کرتی تھیں ۔عطیہ سید کی والدہ بھی بہت پڑھی لکھی خاتون تھیں انھوں نے آج کل کے پی۔ ایچ۔ ڈی کے برابر کا ادیب فاضل کیا ہوا تھا۔ ان کی والدہ مطالعہ کی بہت شوقین تھیں۔ انھوں نے تاریخِ اسلام اور تاریخِ ادب کے علاوہ بہت سا ادب پڑھ رکھا تھا۔ وہ فکشن کے علاوہ شاعری کی طرف بھی خاص دلچسپی رکھتی تھیں عطیہ سید کی والدہ کی خواہش تھی عورت ہو تو انٹی لیکچوئل ہو۔

عطیہ سید کے والد خود ایک بہت بڑا نام ہے۔ ان کا شعری ذوق بھی والدین کے زریعے منتقل ہوا عطیہ سید کے والد ڈاکٹر سید عبداللہ عالم، محقق، مفکر، ادیب اور استاد تھے۔ انھیں شاعری سے بہت لگاؤ تھا۔ عطیہ سید کے والد ہمیشہ انٹی لیکچوئل بات کرتے تھے۔ عطیہ سید کے دادا جی بھی پڑھے لکھے تھے۔ حکمت کو جانتے تھے۔ لوگ انھیں "شاہ صاحب" اور "طبیب میاں کے نام سے پکارتے تھے۔ ان کے سراپے میں جسمانی جمال اور روحانی جلال بڑا واضح تھا۔ وہ سخت نظم وضبط کے قائل تھے۔

عطیہ سید کے گھر ادبی لوگوں کا آنا جانا تھا۔ انھوں نے بچپن سے اپنے گھر میں بہت بڑی علمی و ادبی شخصیات کو دیکھا ہے۔ وہ جب بیٹھے سنجیدہ گفتگو کر رہے ہوتے تھے تو عطیہ سید بھی وہاں جا کر بیٹھ جاتی تھیں اور سنتی رہتی تھیں۔

ادبی ذوق وشوق

عطیہ سید کو لکھنے اور پڑھنے کا شوق سکول کے زمانے سے تھا۔ وہ بچپن سے ڈائری لکھتی تھیں۔ وہ ایک قابل اور ذہین طالبہ تھیں۔ وہ علم و ادب سے گہرا لگاؤ رکھتی تھیں۔ انھوں نے لکھنے سے قبل تمام تر مشرقی اور مغربی ادیبوں کو پڑھ رکھا تھا۔ انھوں نے مغرب سے ارسطو، افلاطون، روسو، مارکس، گوئٹے اور شیلے وغیرہ اور مشرق سے علامہ اقبالؒ، رومیؒ، سعادت حسن منٹو وغیرہ کو پڑھ رکھا تھا۔ انھوں نے آٹھویں کلاس میں اپنا پہلا مضمون "میں اگر بلبل ہوتی" لکھا۔ جس کا تمام اساتذہ نے خوب سراہا۔ وہ ایک انٹرویو میں کہتیہیں:

> "میرا سب سے پہلا تخلیقی مضمون "میں اگر بلبل ہوتی" میں نے آٹھویں جماعت میں لکھا تھا، کیونکہ استاد نے کہا تھا کہ آپ نے کسی نہ کسی پرندے سے اپنے آپ کو Identify کر کے اس کا احوال لکھنا ہے۔ تو وہ مضمون بڑا مشہور ہوا۔ پروفیسر سراج الدین صاحب جب سکول آئے تو ان کو بھی سنایا گیا۔ انھوں نے اس کی بہت تعریف کی۔"44

فلسفہ ہمیشہ سے عطیہ سید کا پسندیدہ موضوع رہا ہے۔ تفکر، فکر و سوچ انھیں اپنے والدین سے ورثے میں ملی۔اس حوالے سے وہ کہتی ہیں:

"جب انسان بہت کم سن ہوتا ہے تو وہ اپنے آپ کو ترم خان سمجھتا ہے تب میں کہا کرتی تھی کہ جس طرح میں نے اپنے والدین سے شاعری کو نہیں لیا بلکہ میں نثر کی طرف آئی یہ میری انفرادیت ہے اسی طرح فلسفہ میری انفرادیت ہے، لیکن ایک دفعہ ناصر کاظمی صاحب سے میری بات ہوئی تو وہ کہنے لگے کہ آپ کا کیا مضمون ہے ؟ میں نے جب انھیں بتایا تو وہ چپ ہو گئے ، میں نے کہا: کیا آپ کو حیرت ہوئی ؟ کہتے : نہیں نہیں، ڈاکٹر سید عبداللہ کی بیٹی ہو اور فلسفے کی طرف رجحان نہ ہو اس میں حیرت تو کوئی بھی نہیں۔"45

عطیہ سید کا فلسفے کی طرف رجحان اپنے خاندانی پس منظر کی وجہ سے تھا۔ان کے والد ڈاکٹر سید عبداللہ بھی بھی معروف مفکر اور دانشور تھے عطیہ سید اپنے والد کے بارے میں کہتی ہیں:

"میرے والد کا رجحان بھی فلسفہ کی طرف تھا۔اب جب کہ میں پیچھے پلٹ کے دیکھتی ہوں اور آدمی پختہ عمر ہو چکا ہوتا ہے اور اپنے انا کے خول سے بھی نکل آیا ہوتا ہے تو میرا خیال ہے کہ میرے والدین میں شاید ایرانی النسل ہونے کا اثر ہے کیونکہ ایرانی تفکر کرنے والے یعنی سوچنے والے لوگ ہیں۔ان کے ہاں اس چیز کی روایت بھی ہے، تو میرے والد بھی مغرب کی کتابیں پڑھتے تھے، مشرق کی انھوں نے پہلے ہی پڑھ رکھی تھیں۔"46

عطیہ سید کے بھائی سید سجاد کا رجحان بھی فلسفہ کی طرف تھا، وہ کہتی ہیں:

"میرے بھائی سید سجاد بھی فلسفہ پڑھتے تھے ایک بار ان سے کسی نے کہا کہ تم کیا پارٹی ہاؤس میں آکر شو آف کرتے ہو کہ مجھے فلسفہ کے بارے پتا ہے یقیناً تم عطیہ

سید کی بکس پڑھتے ہو، لیکن خدا گواہ ہے کہ انھوں نے میرے نوٹس کبھی نہیں پڑھے۔"47

عطیہ سید نے اپنے ادبی سفر کا آغاز 1987ء میں کیا، مگر اس سے قبل بھی عطیہ سید نے چند ایک تحاریر لکھ رکھی تھیں۔ مثلاً وہ ایک جگہ خود لکھتی ہیں:

"بہت سے نشانیہ سوال ابھرتے ہیں۔ ایک خاص سوال جو یقیناً جواب کا منتظر ہے کہ میں ادبی ماحول میں پروان چڑھنے کے باوجود ایک طویل عرصے تک تخلیق سے کیوں دور رہی۔ یہ بھی کہ آجی کی بیماری کے دوران کیوں میں نے پہلی مرتبہ تخلیقی تحریر لکھنے کی کوشش کی؟ کسی نے کہا یہ Catharsis تھا۔ کسی نے کہا یہ تسلسل کی خواہش تھی۔"48

لہذا عطیہ سید کے والد ڈاکٹر سید عبداللہ کی علالت اور وفات سے بہت پہلے انھوں نے 1971ء میں یہ تحریر لکھی:

"میرا تمھارا رشتہ تخلیق سے ہے۔ اس لیے میں چاہتی ہوں کہ کچھ کروں۔ لیکن کیا؟ الفاظ میری گرفت میں نہیں، سُر میرے بس میں نہیں، رنگ بے قابو ہیں، اور سنگ تراشنے کی سکت نہیں۔ لے دے سوچ ایک راستہ ہے۔۔۔ہاں سوچ، جس کے گھوڑے کی باگ میرے ہاتھ میں ہے، جو سرپٹ آسمان کی بلندیوں تک اُڑنے اور زمین کی اتھاہ پستیوں میں اترنے کو تیار ہے، جو اپالو کی رتھ بھی ہے اور ہیڈز کے اندھے دیوتا کی بھگی بھی۔۔۔ تو کیا اس کے زریعے سے میرا تمھارا رشتہ استوار ہو سکتا ہے"49

اسی طرح 22اپریل 1972ء کو عطیہ سید کی ڈائری میں یہ لکھا ہے:

"تخلیق کے سوتے پھوٹ

ذہن کی بنجر کوکھ سے،

اور سنگلاخ چٹانوں کو گلنار بنادے۔"50

عطیہ سید کا پہلا افسانہ "کرسمس کی شب" ہے۔ جو انھوں نے 1987ء کو لکھا۔ اس افسانے کے بارے میں وہ لکھتی ہیں:

"بظاہر رمضان کی اس گرم رات سے "کرسمس کی شب" کا ظہور اچھنبے کا باعث ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے یہ صدیوں کی خاموشی کے بعد گلیشیر کا پگھلاؤ ہے۔ غیر متوقع اور حادثاتی۔"51

عطیہ سید کا پہلا مجموعہ "شہرِ ہول" ہے جو 1995ء میں منظرِ عام پر آیا۔ جس کو سنگِ میل پبلی کیشنز نے شائع کیا۔ "شہرِ ہول" کا دوسرا ایڈیشن "خزاں میں کونپل (شہرِ ہول)" کے نام سے 2004ء میں شائع ہوا۔ اس کو بھی سنگِ میل پبلی کیشنز نے ہی شائع کیا۔ اس مجموعے میں کل پندرہ افسانے ہیں اور 248 صفحات ہیں۔ یہ افسانوی مجموعہ عطیہ سید اپنے والد ڈاکٹر سید عبداللہ کے نام کرتے ہوئے کہتی ہیں "اپنے والد ڈاکٹر سید عبداللہ کے نام، جن کے زندگی بسر کرنے کے قرینے سے میں نے سیکھا کہ خزاں میں بھی کونپل کھل سکتی ہے" اس افسانوی مجموعے کا پیش لفظ "افتخار جالب" نے انتہائی خوبصورت انداز میں لکھا ہے۔ اس کے بعد عطیہ سید نے اپنے پہلے افسانے کے آغاز کے بارے میں "کہانیوں کی کہانی" کے عنوان سے تفصیل سے لکھا ہے۔ اس مجموعے میں شامل پندرہ افسانوں کی ترتیب یہ ہے:

1۔ کرسمس کی شب 2۔ شہرِ ہول 3۔ پریزاد 4۔ ہوٹل سلازار 5۔ میری میرا 6۔ چھ بجے کی خبر 7۔ خزاں میں کونپل 8۔ بنتِ اسرائیل 9۔ کریکے اور چینی کمرہ 10۔ ایبل اور وہ 11۔ آخری کہانی 12۔ آنسو کا نمک 13۔ شمالی ستارہ 14۔ عشقِ تمام 15۔ برگزیدہ

لفظ "شہرِ ہول" اپنے اندر گہری معنویت لیے ہوئے ہے کیونکہ اس مجموعے کی زیادہ تر کہانیاں امریکن طرزِ زندگی کی عکاسی کرتی ہیں۔ کردار بھی امریکن ہیں۔ اسی مجموعے پر عطیہ سید کو ہیرلڈ (کراچی) نے favorite fiction of the year قرار دیا۔

"شہرِ ہول" کے لکھنے کے آغاز کے بارے میں وہ ایک انٹرویو میں کہتی ہیں:

"میں جب نیویارک میں زیرِ تعلیم تھی، تب میں نے دیکھا کہ امریکہ کے بڑے شہر بڑے بھیانک ہیں جو میں نے بعد میں اپنی کہانیوں میں بھی لکھا، وہاں پر کسی نیو یارکی کو میں نے کہا کہ آپ کا شہر تو پر ہول ہے، اس نے کہا: ہاں مگر یہاں تخلیقی صلاحیتیں بیدار ہوتی ہیں۔ اس وقت میں نے اس کی بات نہیں مانی لیکن جب نے خود اس شہر کی ہولناکیوں کے بارے میں لکھنا شروع کر دیا تو پھر مجھے اُس کی بات میں صداقت نظر آئی۔"52

نفسیات نگاری کی روایت

اس کرّہ ارض پر انسان کی ذات ہمیشہ سے دلچسپی کا باعث رہی ہے۔ انسان کی اندرونی کیفیات، ذہنی واردات اور اس کے خارجی اعمال وافعال کو کھنگالنے کی ہر ممکن کوشش کی گئی ہے۔ اسی سلسلے میں قدیم ماہرین نے مختلف سوالوں کے جوابات تلاش کیے۔ انسان کی ماہیت اور اسکے نفسی کوائف کو جاننے کا علم ہی علمِ نفسیات کہلایا۔ یوں علمِ نفسیات انسان کے ظاہری و باطنی اعمال وافعال، حرکات وسکنات، عمل اور اس کے جوابی عمل براہ راست یا بلاواسطہ مطالعہ کرتا ہے۔

نفسیات انسانی کردار اور ذہن کا مطالعہ کرتی ہے جبکہ ادب معاشرے کی عکاسی اور ترجمانی کرتا ہے۔ اس طرح ادب اور نفسیات کا چولی دامن کا ساتھ ہے ادب، نفسیاتی روّیوں، جذباتی اتار چڑھاؤ اور رجحانات کا نام ہے تو دوسری طرف نفسیات کا تعلق انسانی زندگی اور انسانی مسائل کے ساتھ ہے۔ یوں ادب کا نفسیات کے ساتھ رشتہ لازم ملزوم ہے۔ نثری یا شعری دونوں صورتوں میں ادب کا نفسیات کا ساتھ رشتہ اور بھی گہرا ہو جاتا ہے۔

افسانوی ادب انسان کی تمام نفسیاتی کیفیات کا مظہر رہا ہے افسانہ نگار کی اپنی ذہنی کیفیات بھی ہوتی ہیں جس کا اظہار وہ اپنی کہانیوں میں موجود کرداروں کے مکالموں کی صورت میں کرتا ہے۔انسانی زندگی میں نفسیات کا عمل دخل روزِاوّل سے ہے دونوں کا رشتہ آپس میں بہت گہرا ہے دنیا میں تعلیم کے جتنے موضوعات پر درس دیا جاتا ہے ان میں سے شاید ہی کوئی موضوع ایسا ہو جہاں نفسیات کی ضرورت واہمیت نہ رہی ہو۔نفسیات کا عکس دنیا کے ہر شعبے میں دکھائی دیتا ہے

نفسیات یعنی سائیکالوجی یونانی زبان کا لفظ ہے۔"Psychology"لفظ دو الفاظ "Psycho" اور"logy" سے مل کر بنا ہے۔"Psycho"کے معنی روح کے ہے جبکہ "logy" کے معنی گفتگو ،بات اور علم کے ہیں۔اس طرح کے"Psychology" کے معنی "روح کا علم" کے ہیں۔یوں روح کے بارے میں گفتگو اور علم کو علمِ نفسیات یعنی "نفس کا مطالعہ "کہا جاتا ہے۔فیروز اللغات میں نفسیات کے معنی اس طرح درج ہیں:

فیروز اللغات میں مولوی فیروز الدین کے مطابق:

> "نفسیات(نف-سی -یات)[ع-ا-جز]ذات سے متعلق باتیں(2)علم النفس،انسان کے نفسی وعوامل اور لاشعور کی تحقیق کا علم(Psychology)"[53]

نفسیات انسانی کردار کے مطالعے کا نام ہے۔نفسیات انسان کے دماغی شعور کا وہ علم ہے۔جس کی پرتیں زندگی کے ساتھ مربوط ہیں۔ماہرین نے نفسیات کی کئی تعریفیں کی ہیں۔ولیم جیمس نے 1890ء میں نفسیات کے بارے میں کہا تھا۔

> "Psychology is a science of Mental Life both of its phenomena and of their conditions. The phenomena are

such things, as we call feelings, desires, cognitions, reasonings, decisions and the like.”[54]

بعض ماہرین نے نفسیات کو ایک سائنسی عمل قرار دیا ہے۔ مثلاً

“Psychology is a science of human and animal behavior; it includes application of this science to human problem.”[55]

اُردو زبان وادب میں افسانوی ادب کا آغاز جنّوں پریوں اور جادو گروں جیسے کرداروں پر مشتمل داستانوں سے ہوتا ہے۔ یہ داستانیں وہاں کی مخصوص معاشرت کی عکاسی کرنے کے ساتھ ساتھ انسان ک کسی نہ کسی نفسی کیفیت کو بھی ظاہر کرتی تھیں۔

داستانوی دور کے بعد سائنسی دور بھی ملتا ہے۔ جس میں انسان نے اپنی ذات اور شخصیت کے دائرے سے نکل کر کائنات پر غور و فکر شروع کر دی۔ یوں انسان نے اپنی عقل کی طرف توجہ کی۔ اور چونکہ عقل و شعور نفسیات کا ہی اہم حصّہ ہے۔ اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ انسانی نفسیات اس وقت بھی موجود تھی۔

بیسویں صدی کے آغاز میں کہانی انسانی سماج سے انسانی کردار پر مرتکز ہو کر انسان کے اعمال وافعال اور تصورات کا بھید تلاش کرتی دکھائی دیتی ہے مگر یہاں بھی انسانی کردار کی باطنی کیفیات پر سرسری نظر ڈالی جاتی ہے اور خارجی مشاہدات پر زیادہ زور دکھائی دیتا ہے۔

1930ء میں انسانی زندگی کے نفسی اعمال وافعال پر خاص توجہ دی گئی اور یہی دور نفسیات نگاری کا اہم دور شمار ہوتا ہے۔

مغرب کے افسانوی ادب میں جن فکشن نگاروں نے نفسیات کا اثر قبول کیا ان میں ڈی ایچ لارنس، جیمز جوائس، ورجینا وولف، مارسل پردست، فلابیر، موپساں، ایملی ژولا اور آلڈس ہکسلے نمایاں ہیں۔ لارنس کی تحریروں کا مقصد صحت مند جنسی توازن کی تبلیغ تھا۔ جیمز جوائس کا نسان مکانیکی زندگی کے باعث ناآسودہ رہتا ہے۔ ورجینا وولف انکشافِ ذات کو شعوری دور کے زریعے اُبھارتی ہیں۔

مغرب کی طرح اُردو افسانوی ادب میں بھی جنسی نفسیات کو برتا گیا۔ سجاد حیدر یلدرم کے افسانوی مجموعہ "خیالستان" کے ایک افسانے "خارستان و گُلستان" کو اُردو کا پہلا جنسی افسانہ قرار دیا جاتا ہے، تاہم 1934ء میں "انگارے" کی اشاعت سے جنس نگاری کا باقاعدہ آغاز ہوا۔ "انگارے" کے مصنفین احمد علی، سجاد ظہیر، رشید جہاں اور محمود الظفر کی شدت پسندی اور مذہب بےزاری جیسے موضوعات پر اعتراضات بھی ہوئے مگر ان افسانوں نے افسانوی ادب کو نئی روح اور نیا ذہن عطا کیا۔ سعادت حسن منٹو نے جنسی مسائل کو اور زیادہ گہرائی سے محسوس کیا۔ منٹو کے افسانے ہمیں بتاتے ہیں کہ جس سماجی، اخلاقی اور تمدنی نظام میں ہم زندہ ہیں اس میں فرد کے احساس، جذبے اور جبلّت پر کیا گزرتی ہے۔ منٹو نے جنس کو محض جنسی مسئلے کے طور پر نہیں لیا بلکہ اس کے نزدیک عام جنسی تجربہ بھی انکشافِ ذات کی حقیقت رکھتا ہے۔

منٹوؔ کے بعد راجندر سنگھ بیدی کے ہاں جنس کا موضوع گہری معنویت کے ساتھ نمایاں ہوا ہے۔ ان کے افسانے حقیقت نگاری پر مشتمل ہیں۔ راجندر سنگھ بیدی کردار کے اعمال کے زریعے اس کی نفسی کیفیات کو اجاگر کرتے ہیں۔ یوں فرد کے اعمال اور اس کی نفسیات مل کر کہانی کو بناتے ہیں۔ کرشن چندر کی تخلیقات میں سماجی حقائق زیادہ ہیں۔ انھوں نے انسان کے اند کی کیفیات کم بیان کی ہیں مگر انھوں نے جن معاشرتی مسائل کی نشاندہی کی ہے اس کو نفسیاتی بصیرت کے بغیر نہیں سمجھا جاسکتا۔

عصمت چغتائی نے عورت کے جنسی مسائل اور اس کی نفسیات کو بڑی بے باکی سے بیان کیا ہے۔ عصمت چغتائی نے مسلمان گھرانوں کی عورتوں کے جنسی مسائل کو کمال فنکاری سے اپنے افسانوں میں جگہ

دی۔ان کے افسانے مثلاً تِل، لحاف اور گیندا وغیرہ عورت کے کئی جنسی اور نفسیاتی مسائل کا احاطہ کرتے دکھائی دیتے ہیں۔

محمد حسن عسکری کے افسانے جدید نفسیاتی افسانوں میں شمار ہوتے ہیں۔انھوں نے پریم چند اور کرشن چندر کے بعد نہ صرف پہلی بار شعور کی رو کی اصطلاح کو باقاعدہ طور پر اپنایا بلکہ شعور کی رو کے زریعے کرداروں کی نفسی کیفیات کو بھی منظرِ عام پر لایا۔ہم جنسی کے موضوع پر "چائے کی پیالی اور " پھسلن " اہم ہے۔قرۃ العین حیدر کے افسانے ورجینا وولف کے افسانوں کے اثرات لیے ہوئے ہیں۔قرۃ العین حیدر ورجینا وولف کی طرح اپنے کرداروں کی نفسی کیفیات کو ماضی کی یادوں اور مستقبل کے حسین خوابوں کے ساتھ جوڑ کر ایسی طلسماتی فضا قائم کرتی ہیں کہ قاری اس کے حسن میں کھو کر رہ جاتا ہے۔

ممتاز شیریں کے افسانوں کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ انھیں علمِ نفسیات سے گہری دلچسپی رہی ہے۔ان کے افسانے مغربی ادب کا گہرا اثر لیے ہوئے ہیں۔ان کے ہاں بھی شعور کی رو کا عام استعمال ملتا ہے۔ان کے افسانے عورتوں کی جنسی الجھنوں پر مشتمل ہیں۔عزیز احمد کے افسانوں کا مرکزی نقطہ بھی جنس نگاری ہی رہا ہے۔ حقیقت نگار ہونے کے باوجود نیچرل ازم بھی ان کے افسانوں کا خاص موضوع رہا ہے۔سید فیاض محمود کے ہاں بھی نوجوان لڑکے اور لڑکیوں کے نفسیاتی مسائل کی عمدہ تصویر کشی ملتی ہے۔ممتاز مفتی کا شمار ان افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے جنھوں نے نفسیات نگاری کو خاص موضوع کے طور پر برتا۔اس کے بعد انھوں نے جنس نگاری کے موضوع پر لکھنا شروع کیا۔ان کے یہاں فرائڈ اور ژونگ کے اثرات نمایاں ہیں۔ان کے کردار عام گھریلو کردار ہیں۔

آغا بابر کے افسانوں میں اُدھیڑ عمر کی عورتوں کی نفسی کیفیات کا اظہار ملتا ہے۔رحمٰن مذنب نے جنس کے زاویے کو معاشرتی تناظر میں دیکھا۔انتظار حسین کے افسانوں میں داستان، حکایت، مذہبی روایات، قدیم اساطیر اور دیومالا کی مدد سے ایسی فضا تشکیل پاتی ہے جو کئی زمانوں پر مشتمل ہے۔ان کے افسانے انسان کے باطن کے افسانے ہیں۔مظفر علی سید کا نقطہ نظر بھی یہی ہے ان کے ہاں نفسیاتی کیفیتوں کا ذکر عام ملتا ہے۔

انور سجاد کے افسانوں کا موضوع جبر کے خلاف احتجاج ہے۔ سریندر پرکاش کے افسانوں کا موضوع انسانی باطن کی شکستگی اور ویرانی کا شدید احساس ہے۔ بلراج مین را کے افسانے ذاتی و جنسی علامتوں اور جوگندر پال کے افسانے نفسیاتی بصیرت پر مشتمل ہیں۔ بلراج کومل اور رام لعل نے انسان کی نفسیاتی الجھنوں کی اپنا موضوع بنایا۔ رشید امجد کے ہاں معاشرے کی ہولناکی کا احساس نمایاں ہوتا ہے۔

مجموعی طور پر اُردو افسانے اور نفسیات نگاری کا تعلق ہر دور میں نمایاں رہا۔ اُردو افسانے نے شعوری اور لاشعوری طور پر جہاں تک ممکن ہوا استفادہ حاصل کیا۔ آزادی سے پہلے کے افسانہ نگار فرائڈ سے زیادہ متاثر دکھائی دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک نفسیات کے دو پہلو یعنی جنسی اور لاشعوری محرکات زیادہ اہم رہے۔ مگر آزادی کے بعد کے لکھنے والوں نے اس روش سے ہٹ کر انسان کے مختلف نفسیاتی مسائل کو اپنے افسانوں میں جگہ دی۔ شعور، لاشعور اور تحت الشعور کے ساتھ ساتھ تحلیلِ نفسی کا عمل بھی ابھر کر سامنے آیا۔ فرائڈ کے مقابلے میں ژونگ کے اثرات میں کشش محسوس کی جانے لگی۔ یوں افسانے نے تہذیبی رشتوں کی تلاش و جستجو اور معاشرے میں فرد کی حیثیت کی متعین کیا۔ اس سے جہاں اُردو افسانے میں تہذیبی رچاؤ پیدا ہوا وہی ساتھ ہی خارج انسان کی باطنی حقیقت کی علامت بن کر نمودار ہوا۔ اس طرح اُردو افسانہ انسان کی داخلی اور سماجی زندگی کی دستاویز بن گیا۔

حوالہ جات

---

[1]۔عطیہ سید سے انٹرویو،15 جنوری 2021

[2]۔ محولہ بالا

[3]۔آجی، مشمولہ:"دشت، بارش اور رات"، ص220

[4]۔ محولہ بالا، ص222،221

[5]۔عطیہ سید سے انٹرویو،15 جنوری 2021

[6]۔ محولہ بالا

[7]۔راقمہ۔پرسنل فائل عطیہ سید۔فائل نمبر108/1۔لاہور:اسٹیبلشمنٹ برانچ لاہور کالج برائے خواتین یونیورسٹی

[8]۔آجی، مشمولہ:"دشت، بارش اور رات"، ص218،217

[9]۔عطیہ سید سے انٹرویو، محولہ بالا

[10]۔ محولہ بالا

[11]۔ محولہ بالا

[12]۔راقمہ۔پرسنل فائل عطیہ سید۔فائل نمبر108/1۔لاہور:اسٹیبلشمنٹ برانچ لاہور کالج برائے خواتین یونیورسٹی

[13]۔راقمہ۔پرسنل فائل عطیہ سید۔فائل نمبر108/1۔لاہور:اسٹیبلشمنٹ برانچ لاہور کالج برائے خواتین یونیورسٹی

[14]-ایضا

[15]-ایضا

[16]-ایضا

[17]۔عطیہ سید سے انٹرویو، محولہ بالا

[18]۔ محولہ بالا

[19]۔ محولہ بالا

[20]۔ محولہ بالا

[21]۔ محولہ بالا

[22]۔ محولہ بالا

[23]۔ محولہ بالا

[24]۔ محولہ بالا

[25]۔ عمران میر، انٹرویواز عطیہ سید، کسبِ کمال، پی ٹی وی، 5مارچ 2017ء

[26]۔عطیہ سید سے انٹرویو، 15 جنوری 2021ء

[27]۔ محولہ بالا

[28]۔ کہانیوں کی کہانی، مشمولہ: "خزاں میں کونپل"، ص27

[29]۔ محولہ بالا، ص28

[30]۔ محولہ بالا، ص28

[31]-کہانیوں کی کہانی، مشمولہ: خزاں میں کونپل، ص29

[32]۔ محولہ بالا، ص31

[33]۔عطیہ سید سے انٹرویو، 15 جنوری 2021

[34]- اے بی اشرف، سلمیٰ بینلی، ڈاکٹر۔"عطیہ سید کی کہانیوں کا تجزیاتی مطالعہ"مشمولہ: مجلّہ سپوتنک(ماہنامہ) جلد نمبر16، شمارہ نمبر5۔لاہور: سپوتنک دی مال، 2005ء ص141

[35]۔ فیس بک، غلام حسین ساجد، 16 جولائی 2019ء

[36]-ایضا

[37]- اے بی اشرف، سلمیٰ بینلی، ڈاکٹر۔"عطیہ سید کی کہانیوں کا تجزیاتی مطالعہ"مشمولہ: مجلّہ سپوتنک(ماہنامہ) جلد نمبر16، شمارہ نمبر5۔لاہور: سپوتنک دی مال، 2005ء، ص148

[38]-عطیہ سید"دریا کنارے"لاہور، دستاویز، 2014ء، ص141

[39]۔ فیس بک، ڈاکٹر عامر سہیل، عطیہ سید اور ہرمن ہیسے کا نیا اُردو ترجمہ، ایبٹ آباد، 8 دسمبر 2020ء

[40]۔ محولہ بالا

[41]۔ عمران میر، کسبِ کمال، محولہ بالا

[42]۔ میری میرا، مشمولہ:"خزاں میں کونپل"، ص122، 121

[43]۔ برگزیدہ، مشمولہ:"خزاں میں کونپل"، ص247

[44]۔ عمران میر، کسبِ کمال، محولہ بالا

[45]۔ محولہ بالا

[46]۔ محولہ بالا

[47]۔ محولہ بالا

48۔ کہانیوں کی کہانی، مشمولہ: خزاں میں کونپل، ص30

49۔ محولہ بالا، ص 30،31

50۔ محولہ بالا، ص31

51۔ محولہ بالا، ص29

52۔ عمران میر، کسبِ کمال، محولہ بالا

53-الحاج مولوی فیروزالدین، فیروزالغات، اُردو جامع، فیروز سنز، لاہور، 2005ء، ص1368

54- James William, The principles of psychology, vol.1, Dover Publications Inc, 1950, P.1

55- Margan Clifford T. Introduction to psychology, Tata McGraw Hill Education Pvt.Ltd, New Delhi, 1993, P.4

باب دوم

عطیہ سید کے افسانوں کے کرداروں کا نفسیاتی مطالعہ

عطیہ سید کے افسانوں کے کرداروں کا نفسیاتی مطالعہ

کرّہ ارض پر زندگی کا آغاز اور ارتقا ایک ایسا معمہ ہے جس کی حقیقت کی تلاش میں تمام علوم پیش پیش رہے ہیں۔ابتدا سے ہی انسان کے جذبات و احساسات،امکانات اور تجربات میں تبدیلیاں رونما ہوتی رہی ہیں۔جس کی وجہ سے انسان کے تجربات میں بھی تبدیلی وقوع پذیر ہوتی رہی۔ شاعر یا ادیب کائنات کی بے ترتیبیوں کو ایک نئی ترتیب دے کر کہانی میں پیش کرتا ہے جو حقیقی زندگی کی ایک فرضی کہانی ہوتی ہے۔اسی فرضی کہانی کے اندر فرضی کردار بھی ابھرتے ہیں۔جو کہانی کو آغاز سے لے کر اس کے منطقی انجام تک پہنچاتے ہیں۔

انسان نے آغاز سے ہی اپنے واقعات و تجربات کو دوسروں تک پہنچانے کے مختلف طریقے تلاش کیے ہیں۔آغاز میں یہ کہانیاں صرف آواز کا روپ دھارے ہوئے تھیں،زبان ہی کہانی کا ذریعہ اظہار تھا،اور سننے والا ایک مخصوص وقت تک اس کو سنتا تھا۔کہانی کو ابھی تحریری شکل نہیں ملی تھی۔ان کہانیوں کو لوگوں نے سردیوں کی لمبی راتوں میں وقت گزاری کے لیے استعمال کیا۔یہی کہانیاں داستان کہلاتی تھیں۔ انھیں داستانوں کو کبھی نثری اور کبھی منظوم صورت میں سنایا گیا۔یونان میں منظوم داستانوں نے ''Epic''رزمیہ شاعری اور ''Tragedy''کی صورت اختیار کر لی۔یہاں کہانی نے ترتیب پائی اور پلاٹ کو کردار پر فوقیت دی جانے لگی ۔پلاٹ اور کردار ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں۔قدیم داستانوں میں پلاٹ کے ڈھیلے پن کو یا اس کی عدم موجودگی کو کرداروں کی مافوق الفطرت خصوصیات سے پُر کیا جاتا تھا۔فرد اور ریاست کا بھی چولی دامن کا ساتھ ہے اس صورت میں کہانیاں بھی حقیقی صورت میں پیش کی جانے لگیں۔اس حوالے سے کردار بھی نئی صورت میں سامنے آئے۔بعد ازاں ڈرامہ،ناول اور افسانے وغیرہ میں ان کہانیوں کو پلاٹ اور کرداروں کے ذریعے پیش کیا گیا۔کردار نگاری کے دو طریقے ہیں:

1. بلاواسطہ
2. بالواسطہ

بلاواسطہ طریقے میں ادیب کرداروں کی خصوصیات اور ان کا حلیہ قارئین کو بتادیتا ہے جب کہ بالواسطہ طریقے میں ادیب کرداروں کو گفتگو کے میدانِ عمل میں متحرک دکھاتا ہے جس سے قاری یا ناظر ان کی خصوصیات کو پرکھ لیتا ہے۔

جدید دور میں کردار کسی بھی قصّے اور کہانی کے لیے اہم ضرورت بن گیا ہے۔ جدید دور کی زندگی ایک پیچیدہ صورت اختیار کر گئی ہے۔ ادب میں زندگی کے واقعات و تجربات کے اظہار کے لیے فرضی کردار تخلیق کیے جاتے ہیں۔ نثر اور شاعری دونوں میں کرداروں کی یکساں ضرورت اور اہمیت ہے۔ مضبوط پلاٹ کی وجہ بھی مضبوط کردار نگاری ہی ہے۔

فکشن میں کردار اپنے تمام تر لوازمات کے ساتھ جلوہ گر ہوتے ہیں۔ کہانی کرداروں کے مکالموں سے آگے بڑھتی ہے۔ فکشن میں بعض اوقات بیانیہ طریقے سے کرداروں کے لباس اور چال ڈھال سے ان کی خصوصیات کا اظہار کیا جاتا ہے۔، اور بعض اوقات ان کی بول چال، لہجے، چہرے کے تاثرات اور جسمانی اعضاء کی حرکات و سکنات سے ان کی تہذیب اور نفسیات کا پتا چلتا ہے۔ یوں ظاہر و باطن کے امتزاج سے ایک مکمل کردار ہمارے سامنے آجاتا ہے۔ فکشن نگار انسانی زندگی کو تحریری شکل میں پیش کرتے وقت جو کردار سامنے لاتا ہے وہ خود بھی انھیں کرداروں میں جھلکتا دکھائی دیتا ہے۔ عطیہ سید کی فکشن کے کرداروں میں ان کا اپنا عکس بھی جھلکتا دکھائی دیتا ہے۔ انھوں نے اپنی زندگی کو جس انداز میں تجرباتی طور پر پرکھا، اسی طرح اپنے کرداروں کے ذریعے وہ سب کہہ ڈالا۔

عطیہ سید اکثر جگہ اپنے کرداروں کے حلیہ، لباس، چال ڈھال اور دیگر خصوصیات قاری کو بتادیتی ہیں اور بعض اوقات وہ کرداروں کی گفتگو سے ان کی جملہ خصوصیات گنوادیتی ہیں۔ وہ کرداروں کو اتنے دلچسپ انداز میں پیش کرتی ہیں کہ قاری، ناظر یا سامع متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ پاتا۔ عطیہ سید نے بعض مقامات پر فینٹسی سے کام لیا ہے۔ وہ معلوم سے نامعلوم تک کا سفر کروا کر حیرت کی اتاہ گہرائیوں میں لے جاتی ہیں۔ اس عمل میں وہ موجودہ لمحات کے اندر چھپی حقیقتوں کو انسانی فطرت کے ساتھ ہم آہنگ کر کے اس طرح پیش کرتی ہیں کہ یہ

فرضی زندگی کی کہانی، اصل زندگی کے مقابلے میں زیادہ بہتر اور پُرکشش محسوس ہونے لگتی ہے۔ قاری جب ان کہانیوں میں موجود مسائل کا ادراک کرتا ہے تو وہ آیندہ کی مشکلات سے لڑنے کے لیے لاشعوری طور پر تیار ہو جاتا ہے۔

عطیہ سید کے افسانوں میں کردار بہت کم آتے ہیں۔ وہ کہانی کی ضرورت کے مطابق کردار لاتی ہیں۔ بعض افسانوں میں ایک یا دو کردار ہیں۔ جیسے افسانہ "تتلی" اور واپسی میں صرف ایک ایک کردار ہے۔ "ڈھلوان" میں ایک کردار ملک صاحب کا ہے درمیان میں ان کی بھتیجی کا ایک کردار آتا ہے۔ افسانہ "دہلیز" میں دو کردار ڈاکٹر یاسر اور جمیل ہیں۔ اور "ڈان کارلوس" میں بھی دو کردار ہیں۔ تیسرا کردار "ڈان کارلوس" نامی کتے کا ہے۔ افسانہ "سبز اندھیرا" "خاموشی" اور "درویشِ رقصاں" میں بھی دو دو کردار ہیں۔ عطیہ سید کے اکثر افسانو ں میں کچھ غائب کردار بھی ہے جن کا صرف نام لیا گیا ہے۔ مثلاً افسانہ "شہرِ ہول" میں کردار "ڈی ڈی کولٹ"، افسانہ "ہوٹل سلازار" میں کردار "لنڈا" افسانہ "فریبِ آرزو" میں فروا کا کردار وغیرہ۔ عطیہ سید کی کردار نگاری کے حوالے سے افتخار جالب کچھ یوں اظہارِ خیال کرتے ہیں:

> "عطیہ سیّد کی کئی کہانیوں کی ساخت ایک خاص انداز کی ہے۔ پہلے مرکزی واقعہ یا کردار آتا ہے جو بتدریج آگے بڑھنا شروع کر دیتا ہے۔ پھر چند ثانوی کردار یا واقعات ظہور پذیر ہوتے ہیں اِن کا ابتدائی تعارف کہانی کی شکل وصورت کو اجاگر کرتا ہے۔ اِن ثانوی کرداروں یا واقعات کی بدولت مرکزی واقعہ یا کردار میں پھیلاو اور وسعت پیدا ہوئی ہے اور افسانہ آگے بڑھنے لگتا ہے"۔[1]

بہت سے افسانوں میں عورت مرکزی حیثیت میں سامنے آئی ہے۔ مثلاً افسانہ "کرسمس کی شب" "شہرِ ہول" "میری میرا" "خزاں میں کونپل" "بنتِ اسرائیل" "ایبل اور وہ" "عشقِ تمام" "برگزیدہ" "رقص" "چھپکلی" "اڑتا پرندہ اور سنہری مچھلی" "دخترِ شب" "تحیرِ عشق" "نوحہ" اور "دو چڑیاں" وغیرہ۔

ایسے افسانے جو مرد کرداروں کے گرد گھومتے ہیں، ان میں افسانہ "ہوٹل سلازار" "کر پکے اور چینی کمرہ" "آخری کہانی" "شمالی ستارہ" "جلوہ" "عکس" "دائرہ" "تعطل کے بعد" "حکایتِ خونچکاں" "ڈھلوان" "بلقیان کا بت" "دہلیز" "ڈان کارلوس" "تتلی" "ہمیں قتل ہو آئیں یاروں چلو" "واپسی" اور "ایک عام معمولی آدمی" وغیرہ شامل ہیں۔

عطیہ سید اکثر کرداروں کے نام نہیں لیتیں بلکہ ان کا تذکرہ جنس کے حوالے سے کرتی ہیں مثلاً افسانہ "چھپکلی" میں دونوں کرداروں کا ذکر لڑکا اور لڑکی کہہ کر کرتی ہیں۔ "شہرِ ہول" کے آخر میں ایک ماڈل خاتون کا کردار آتا ہے جس کو عطیہ سید نے "فیشن ایبل خاتون" کا نام دیا ہے۔ افسانہ "عشقِ تمام (تحیرِ عشق)" میں راوی کے علاوہ ایک نسائی کردار بھی ہے جس کو فربہ اندام امریکن لڑکی کہہ کو مخاطب کیا گیا ہے۔ افسانہ "عکس" میں ایک نسائی کردار ہے۔ جس کو "عورت" کہا گیا ہے۔ کچھ کرداروں کو "وہ" کہہ کر مخاطب کیا گیا ہے۔ جیسے افسانہ "سبز اندھیرا" میں عورت کا کردار۔

ان کے بیشتر کردار مافوق الفطرت قسم کے ہیں۔ مثلاً افسانہ "پریزاد" میں ایک پریزاد (پری کا مذکر) کا مافوق الفطرت کردار ہے جو کسی اور دنیا کا باسی ہے۔ اسی طرح افسانہ "بچھل پائی" "ایک چڑیل کا کردار ہے جو ایک شادی شدہ جوڑے کی زندگی میں داخل ہوتی ہے اور لڑکی کے شوہر پر عاشق ہو جاتی ہے۔ ایک رات چڑیل اس کے شوہر پر حملہ آور ہونے کی کوشش کرتی ہے لیکن اس کی بیوی کلامِ پاک پڑھ کر چڑیل کو بھگا دیتی ہے۔ افسانہ "طلسمِ دل رُبا" میں بیمار لڑکی، عینک والا جن اور سانتا کی دل کش طلسماتی کہانی بیان کی گئی ہے۔ افسانہ "شہزادہ اور نیک بخت" بھی ہمیں پرانے دور کے شاہی نظام میں لے جاتی ہے۔

عطیہ سید کے اکثر افسانوں کے دو نام ہیں، مثلاً عطیہ سید کے پہلے افسانوی مجموعہ کی دوسری اشاعت "خزاں میں کونپل (شہرِ ہول)" میں شامل افسانہ "عشقِ تمام" عطیہ سید کے دوسرے افسانوی مجموعے "حکایتِ جنوں" 2001ء میں "تحیرِ عشق" کے نام سے شائع ہوا۔ اسی طرح عطیہ سید کے پہلے افسانوی مجموعہ کی دوسری اشاعت "خزاں میں کونپل (شہرِ ہول)" میں شامل افسانہ "برگزیدہ" عطیہ سید کے دوسرے

افسانوی مجموعے "حکایتِ جنوں" 2001ء میں "دخترِ شب" کے نام سے شائع ہوا۔ غالباًان ناموں کو عطیہ سید نے خود بدلا ہو گا۔ کیونکہ یہ دونوں افسانے ان کے پہلے افسانوی مجموعے "خزاں میں کونپل (شہرِ ہول)" میں شامل ہیں۔ ہو سکتا ہے جب انھوں نے یہ افسانے لکھے ہوں اس وقت ان کی نظر میں یہی نام بہتر رہا ہو۔ بعد ازاں دوسرے مجموعے کی اشاعت کے وقت انھوں نے ان دونوں افسانوں کے نئے نام رکھ دیے ہوں۔ کیونکہ یہ دونوں افسانے عطیہ سید کے دونوں افسانوی مجموعوں "خزاں میں کانپل (شہرِ ہول)" اور "حکایتِ جنوں" میں ایک ساتھ بالترتیب اوپر نیچے شامل ہیں۔

نفسیاتی مطالعہ

ادب اور نفسیات کا گہرا تعلق ہے۔ دیگر مضامین کی نسبت نفسیات ایسا مضمون ہے جس کا انسانی زندگی سے بہت گہرا تعلق ہے۔ ادب کی تخلیق اور تنقید کرتے وقت نفسیاتی عوامل کارفرما نظر آتے ہیں۔ کسی بھی ادیب کی تخلیقات کا نفسیاتی جائزہ لینے سے قبل اس فنکار کی اپنی نفسیات کا مطالعہ بھی از بس ضروری ہے کیونکہ انسان ہونے کے ناطے اس کے اپنے بھی جذبات واحساسات ہوتے ہیں، مثلاً غم، غصّہ، محبت، نفرت، انا، دکھ، سکھ، اغراض ومقاصد، احساسِ کمتری اور احساسِ برتری وغیرہ۔ یوں جب بھی کوئی ادیب اپنا کوئی ادب تخلیق کرتا ہے تو یہی جذبات واحساسات اس کی تخلیق میں در آتے ہیں۔ اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ تخلیقی عمل انسانی روّیوں، شعور اور لاشعور سے پھوٹتا ہے۔ عطیہ سید ادب کی تعریف کرتے ہوئے کہتی ہیں۔

> "ادب انسان کے جذبات واحساسات کا نام ہے اور نہ صرف جذبات واحساسات کا نام ہے بلکہ اگر اس میں جمالیاتی انداز نہ ہو تو ایسا ادب بیکار ہے۔"[2]

عطیہ سید اُردو افسانہ نگار کے علاوہ ناول نگار، مترجم، دانشور اور ماہرِ اقبالیات بھی ہیں۔ انھوں نے اپنی محنتی کاوشوں سے اردو ادب میں ایک خاص مقام بنالیا۔ اگرچہ انھوں نے اردو نثر کے کئی شعبوں میں طبع آزمائی کی ہے مگر ان کی بنیادی حیثیت ایک بے مثل افسانہ نگار کی ہے۔ افسانہ ان کا پہلا مشغلہ رہا۔ وہ اپنی کتاب "دشت، بارش اور رات" کے آغاز میں لکھتی ہیں:

"میں نے آنکھ کھولی تو کہانی کی لوری سنتے سنتے خواب میں رہنے لگی۔ پڑھنا سیکھا تو شہزادوں، شہزادیوں، لکڑہاروں، کنجوسوں اور نجانے کس کس کی کہانیاں پڑھ ڈالیں۔ میٹرک تک اُردو فکشن کے مشاہیر کو، کالج کے پہلے دو برس میں انگریزی ادب کے اساتذہ کو اور اس کے بعد جرمن، روسی، فرانسیسی شاہکاروں کو اور اب تک بین الاقوامی ادب کی ناقابلِ فراموش تحریروں سے قلب و روح کو سرشار کیا۔ خود میں نے کہانی بہت بعد میں لکھی، لیکن عمر کہانی کے ساتھ بسر کی۔ اس وفا کا ثمر ہے کہ اب کہانی میری شریکِ سفر ہے۔"[3]

اس اقتباس سے پتا چلتا ہے کہ عطیہ سید کو بچپن سے ہی کہانیاں پڑھنے کا شوق تھا۔ اس کے بعد یکے بعد دیگرے انھوں نے تمام تر مشرقی و مغربی ادب پڑھ ڈالا۔ اگرچہ انھوں نے باقاعدہ طور پر لکھنا بہت بعد میں شروع کیا مگر ان کی فکر و سوچ میں کہانی کا بیج ابتدا سے پرورش پا رہا تھا۔ وہ لکھتی ہیں:

"میرے لیے زندگی کہانی ہے اور کہانی زندگی ہے۔ میں ہر کہانی کے ساتھ جنم لیتی ہوں۔ اس کے کردار میری روح میں حلول کر جاتے ہیں۔ کہانی کے انجام کے ساتھ میں تمام ہوتی ہوں لیکن ناتمام ہونے کے باعث دوبارہ کسی اور کہانی میں آنکھ کھلتی ہے، ایک نئی زندگی پاتی ہوں۔ پھر ایک بار اس کے دکھ سکھ سے گزرتی ہوں۔۔۔۔۔ اور اختتام تک پہنچتی ہوں کہ ناگریز ہے۔ یوں جنموں کے چکر بے انت ہے۔"[4]

عطیہ سید ایک حساس ادیبہ ہیں۔ ان کے افسانوں میں معاشرے کے گوناگوں مسائل کی عمدہ عکّاسی ملتی ہے۔ وہ انسان کی تمام تر نفسیاتی کیفیتوں پر ایک ماہرِ نفسیات کی طرح فلسفیانہ بحث کرتی نظر آتی ہیں۔ افسانہ "سبز اندھیرا" میں لکھتی ہیں:

"میں شرمساری سے صوفے میں دھنس گیا کہ میں ایک نقطے میں سمٹ گیا تھا جسے عرفِ عام میں حقیقت کہتے ہیں۔ میں حقائق کی وزنی پتھروں تلے دبا ہوا تھا۔ وہ

دشتِ امکاں تھی، کائنات تھی۔ خلائے محض تھی۔۔۔ اور میں عام سا مسافر تھا۔ مرد
تھا۔ وہ کہانی تھی۔ میں صرف اسے چاہنے والا لکھنے والا۔"[5]

پھر رقم طراز ہیں:

"""ڈاکٹر یاسر!" اس نے پھر یاسر کو اپنی آنکھوں کی گرفت میں لے لیا" جب وہ وقت
آجائے جس سے آگے گھنا جنگل ہے، جہاں دن کو بھی گھٹاٹوپ اندھیرا چھایا رہتا ہے
اور جس کے فرش میں گہری دلدل ہے۔۔۔ تو میری کشتی اس دریا میں ڈال دینا جو
ابدیت کے سمندروں میں جا گرتا ہے۔ مجھے دہلیز پر کھڑا نہ رہنے دینا۔"[6]

جب بھی کوئی ادیب اپنا ملک چھوڑ کر غیر ملک میں پناہ گزین ہوتا ہے تو اس سفر کا عکس اس کی تخلیقات میں صاف دکھائی دیتا ہے اور عطیہ سید کا شمار ایسے افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ جن کے ادبی سفر کا آغاز ہی نیویارک میں قیام کے دوران ہوا۔ عطیہ سید نے کئی ممالک کے دورے کیے اور ان ادوار سے حاصل ہونے والے تجربات، انسانی برتاؤ، ظلم اور ناانصافی جیسی قدروں کو اپنے افسانوں میں جگہ دی۔ عطیہ سید فرد کی بے بسی اور مجبوری کو موضوع بناتی ہیں۔ اور انسان کے بنیادی رشتوں کی بدلتی ہوئی صورت حال کو اپنے افسانوں میں پیش کرتی ہیں۔

اس حوالے سے اے۔بی اشرف اور ڈاکٹر سلمیٰ بینلی لکھتے ہیں:

"عطیہ سیّد کی کہانیوں کے موضوعات میں تنوع ہے جو قاری کو مختلف ذائقوں سے
آشنا اور زندگی کی مختلف پرتوں سے آگاہ کرتا ہے۔"[7]

"عطیہ سیّد نے مختلف ممالک اور معاشروں کی کہانیاں لکھی ہیں۔ ایسا تجربہ اردو میں
باقاعدہ طور پر پہلی بار ہوا۔"[8]

عطیہ سید اپنے کرداروں کی یوں تصویر کشی کرتی ہیں کہ اس پر خاکہ نگاری کا گمان ہونے لگتا ہے۔وہ محض چہرہ نمائی اور خدوخال ہی بیان نہیں کرتیں بلکہ کردار کی نفسی کیفیات، اس کے مزاج و عادات اور طرزِ حیات کو بھی اجاگر کرتی ہیں۔ مثلاً

"۔۔۔۔ایک نازک سفید فام نوجوان سر پر پی کیپ پہنے اور کان میں زمردیں بندہ ڈالے اٹھلاتا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔۔۔۔ نوجوان جس کی رگ رگ میں نسائیت کوٹ کوٹ کر بھری تھی، سب سے بے نیاز ایک حسینہ کج ادا کی مانند اپنے ہی وجود کی نزاکت سے سرشار تھا۔۔۔۔ کبھی کمر کو بل دے کر کولہے مٹکاتا، کبھی سر پر کیپ ٹھیک کرتا، کبھی بندے کو چھیڑتا، کبھی ایک ٹانگ پر ناز سے دوسری ٹانگ رکھتا،اور کبھی کرسی کے بازو پر کہنی ٹکا کر ٹھوڑی کو یوں ادا سے ہاتھ پر اٹھاتا، جیسے ڈنٹھل پر کوئی پھول۔"[9]

عطیہ سید عورت کی نفسیات کو بہت خوب صورتی سے بیان کرتی ہیں۔ مثلاً

افسانہ "نوحہ"

"""عافیت! تمکین کی موت کا بے حد افسوس ہوا۔"

"بڑی عمر کی شادی ـــــ اور یہ انجام۔۔۔۔"ململ کی ساڑھی پہنے ہوئے دوسری خاتون نے لقمہ دیا۔

۔۔۔۔۔۔

"عمر بڑی تو نہیں تھی۔ یہی کوئی تیس برس کی ہو گی تمکین۔"

ایک نیک دل دراز قامت کرسچن خاتون نے جواب میں کہا۔ وہ تمکین کی سکول ٹیچر تھیں۔

"کیا تمکین وگ لگاتی تھی؟"ایک اور تیر انداز خاتون بولی۔

"مجھے معلوم نہیں"آبدیدہ عافیت نے جواب دیا

"بھائی عافیت ! کیا تمکین سچ مچ وگ لگاتی تھی ؟"

"مجھے کیا پتہ —" عافیت نے تنک کر جوب دیا۔"[10]

عطیہ سید کے بعض کردار بہت خاموش اور پُر سکون دکھائی دیتے ہیں لیکن ان کے اندر ایک طلاطم بپا ہوتا ہے۔ وہ دبی ہوئی چنگاری کی مانند اندر ہی اندر سلگتے رہتے ہیں۔ لیکن آخر کار اپنے اندر چھپے ان جذبات کا اظہار کر دیتے ہیں جو ان کے لاشعور میں دبی ہوتی ہیں۔ مثلاًافسانہ "سبز اندھیرا" میں کہانی نگار جس عورت کی کہانی بیان کرتا ہے اس عورت کا کردار ایک خاموش کردار ہے جو جس کی شخصیت میں تضاد دکھائی دیتا ہے جس کو عطیہ سید نے اس طرح بیان کیا ہے۔

"۔۔۔ کبھی وہ بے نیاز تھی اور کبھی سراپا نیاز، کبھی وہ سات سمندر پار تھی اور کبھی ہم یک جان تھے۔ بعض اوقات وہ اس سیپ کے گیت گاتی جس میں بارش کا پہلا قطرہ موتی بنا اور بعض اوقات وہ جنگلوں سے گزرتی سنسناتی ہوا کی مانند تھی۔ ایسا بھی ہوا کہ وہ غریبوں کے لیے پھوٹ پھوٹ کر روئی اور ایسا بھی ہوا کہ اس نے اپنی جاگیر دارانہ ذہنیت کے ثبوت فخریہ پیش کیے۔"[11]

آخر میں وہ اپنے لاشعور میں چھپے جذبات کا اظہار ان الفاظ میں کرتی ہے۔

"""کیا تم نہیں جانتے ؟میں قلو پطرہ ہوں، ایفروڈائیٹ ہوں۔ میں نیک پروین ہوں۔عابدہ ہوں ،زاہدہ ہوں،راہبہ ہوں، میں امراؤ جان ادا ہوں،دھرتی ہوں ،عورت ہوں، کہانی ہوں۔"

"مجھے تم سے محبت ہے۔۔۔اور مجھے معلوم ہے کہ تم بھی مجھ سے پیار کرتے ہو، لیکن تم نہیں جانتے کہ جسے میں چاہتی ہوں وہ میرا ہوتا ہے صرف میرا۔اور میں اسے کہیں جانے نہیں دیتی۔"

"اب میں تمھیں کہیں جانے نہیں دوں گی" اس کی آواز بدل گئی۔اس کے حلق میں کوئی جانور غرا رہا تھا۔"[12]

عطیہ سید کے ہاں لاشعوری محرکات کے حامل کرداروں کی بہتات ہے۔ یہ کردار نفسیاتی الجھنوں اور پیچیدگی کا شکار ہونے کے ساتھ ساتھ مختلف نفسیاتی بیماریوں میں مبتلا دکھائی دیتے ہیں۔ یہ کردار اپنی ذات کے علاوہ اپنی نفسی کیفیتوں سے بھی نبرد آزما نظر آتے ہیں۔ان میں سے بیش تر کردار شکی مزاج، تنگ نظر، خوف زدہ اور قدیم روایات کے اسیر دکھائی دیتے ہیں۔

عطیہ سید کے بہت سے کردار لاشعوری طور پر منفی خیالات کے حامل ہیں۔ دوسروں کی نیت اور روّیوں کو شک کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ وہ حاسد اور تنگ نظر واقع ہوئے ہیں، مثلاً افسانہ "رقص" کی مصطفائی صرف اس وجہ سے آسیہ سے نفرت کرتی ہے کہ وہ ایک غیر ملکی ہے۔اس نفرت کے زیرِاثر وہ آسیہ کے ہر عمل کو شک کی نظر سے دیکھتی ہے۔اور ہر طرح سے آسیہ کو تنگ کر کے اپنی نفرت کا اظہار کرتی ہے۔

کچھ کردار نفسیاتی بیماریوں میں مبتلا ہیں مثلاً افسانہ "ڈھلوان " کا کردار "ہیل زائمر "(Helzeimer) میں مبتلا ہے۔اس پر عجیب نفسیاتی کیفیت طاری ہے۔

> "پھر یہ ستم ہوا کہ اس کے حافظے میں جمع کئی اور چیزیں بھی غائب ہونے لگیں۔ جگہوں کے نام، ملنے والوں کے چہرے، واقعات۔۔۔۔۔ سب نقوش مٹنے لگے۔ برف باری میں راستے اور پگڈنڈیاں گم ہونے لگیں۔اسے خوف آنے لگا کہیں وہ آہستہ آہستہ سب کچھ بھول تو نہیں جائے گا۔۔ اپنی گذری ہوئی زندگی۔۔۔ اپنے بیوی بچے۔۔۔ اور۔۔۔ شاید اپنے آپ کو بھی۔"[13]

افسانہ "ہوٹل سلازار" میں بہزاد وطن سے دوری کے سبب ناسٹیلجیا میں مبتلا ہے۔ وہ ایک اضطرابی کیفیت کا شکار ہیں۔

> "غرضیکہ بہزاد کے دل و دماغ مکمل طور پر ناسٹیلجیا کی دلدوز گرفت میں جکڑے ہوئے تھے۔اس کے اعصاب مغلوب ہوتے جارہے تھے۔ وہ عموماً غنودگی کی حالت میں رہتا۔ صبح جب گھڑی الارم بجاتی تو وہ آنکھیں کھولتا، لیکن اس کا وجود ہلنے سے

انکاری ہو جاتا، اس کے پپوٹے بند ہو جاتے، ذہن نیم غنودگی کی حالت میں ہوتا۔ اور جسم کے پٹھے مزید آرام کی خواہش میں ڈھیلے پڑ جاتے۔ یہ کیفیت سارا دن اس پر طاری رہتی۔ اور وہ اکثر بارہ بجے سے پہلے اٹھنے کے قابل نہ ہوتا۔ اس نیم بیداری، نیم غنودگی کی نباتاتی حالت میں اس کا ذہن گم گشتہ ماضی کے پچھتاوے سے محفوظ رہتا۔ شاید یہ اس کے وجود کا دفاعی ہتھکنڈا تھا۔"[14]

کچھ کردار زندگی سے بیزار آ چکے ہیں۔ اور سب کچھ ہوتے ہوئے بھی تنہائی کا شکار ہیں۔ مثلاً افسانہ "اُڑتا پرندہ اور سنہری مچھلی" میں فروا ملک کا کردار اسی نوعیت کا ہے جس کے پاس شوہر، بچے اور اچھا گھر ہے۔ ہر دیکھنے والا اس کی زندگی کو رشک کی نظر سے دیکھتا ہے مگر اس کے باوجود وہ تنہائی کا شکار ہے اور اپنی اِس پُر آسائش زندگی سے اکتا چکی ہے۔ اس کا اندازہ فروا ملک کی اپنی دوست ارم سے ہونے گفتگو سے لگایا جا سکتا ہے۔

"فروا ملک نے پریشانی سے اپنے ماتھے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا، "بس یہ ایک معمہ ہے۔۔۔ یہ جو ملاپ کی، وصل کی کشش ہے نا، یہ اپنے آپ ہی مر جاتی ہے۔۔۔ اس کی طبعی عمر ہی کم ہوتی ہے۔ ملک کی قربت اب مجھے بور کرتی ہے۔۔۔ گھریلو روزمرہ سے بھی اکتا گئی ہوں۔"

ارم کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ فروا ملک یہ کہہ رہی ہے۔ وہ حیرت سے بولی، "لیکن تمھارا بچہ بھی تو ہے۔۔۔ اس کی محبت ہی تمھاری زندگی کو خوشگوار بنانے کے لیے کافی ہے۔"

"ہاں مگر وہ بھی اب چودہ برس کا ہو چکا ہے اور اس کی آزاد خود مختار زندگی شروع ہونے کو ہے۔ بہت جلد اسے میری کوئی ضرورت نہیں رہے گی۔۔۔ اور نہ وہ میری تنہائی کو کم کر سکے گا۔"[15]

افسانہ "ڈان کارلوس" میں ایک انسان اور جانور کی نفسیات کو ہلکے پھلکے مزاح کے انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ یہ بہت ہی دلچسپ افسانہ ہے جو کہ عطیہ سید کی مزاح کی حِسّ کو ظاہر کرتا ہے۔ اس کہانی کا راوی مرد کردار

شمیم ہے۔جو ایک کرایے کے گھر میں رہنے آتا ہے جہاں مالکن کے ساتھ ایک کتا بھی وہاں پہلے سے موجود ہوتا ہے۔کتے کا نام ڈان کارلوس ہے۔ شمیم کو کتے سے ڈر لگتا ہے اور وہ ہر ممکن کوشش کرتا ہے کی اس کا ڈان کارلوس سے سامنا نہ ہو۔اس کے لیے وہ بہت سی احتیاطی تدابیر کرتا ہے مثلاً دیکھیے۔

سنا تھا کہ ایک مشہور شاعر نے کہا تھا کہ۔۔۔"شب بھر خیالِ یار نے سونے نہیں دیا۔" یہاں صورتِ حال یہ تھی کہ شب بھر"خیالِ ڈان کارلوس " نے سونے نہیں دیا۔ کمرے کے دروازے کو بند کرتے ہی ڈان کارلوس کی غراہٹ قریب آگئی۔۔۔۔ شکر ہے میں نے دروازے کو چٹخنی لگادی تھی، ورنہ ڈان کے ارادے خطرناک قسم کے تھے۔۔۔۔کافی دیر غیض وغضب کے اظہار کے بعد وہ واپس اپارٹمنٹ کے اس حصّے کی طرف چلا گیا جہاں وہ پہلے چھپا ہوا تھا۔ لیکن اپنی تو باقی ماندہ رات خوف کے مارے رتجگے میں ڈھل گئی۔

خدا خدا کر کے صبح ہوئی۔ڈرتے ڈرتے کمرے کا دروازہ کھولا اور جھانک کر صورتِ حال کا جائزہ لیا۔ میدان صاف تھا یا کم از کم نظر آیا، دوڑ کر غسل خانے میں گھس گیا، شاور لینے کے بعد دوبارہ دروازے کو انچ برابر کھول کر جائزہ لیا۔ڈان کہیں دکھائی نہ دے رہا تھا۔ سو میں چوہے کی طرح بل سے نکلا اور برق رفتاری سے اپنے کمرے میں پناہ لی۔"[16]

افسانہ " خاموشی" اور ذکر اُس پری وش کا" بھی ہلکے پھلکے طنز و مزاح میں لکھے گئے ہیں ۔ افسانہ "خاموشی"جعلی پیر مرشدوں پر طنز ہے تو دوسری طرف "ذکر اُس پری وش کا" جارج بش پر طنز ومزاح پر مشتمل افسانہ ہے۔اس طرح کے افسانوں سے عطیہ سید کی خوش طبعی، خوش مزاجی اور مزاح کی حس کا اندازہ ہوتا ہے۔ ان کے مزاح سے ان کی زبان وبیان پر بے پناہ قدرت، رنگینی اور دل آویزی ظاہر ہوتی ہے۔

پروفیسر ڈاکٹر خلیل عطیہ سید کی حسِ مزاح کا اعتراف کرتے ہوئے کہتے ہیں:

"دراصل میرا اور عطیہ صاحبہ کا یک ہی جہاز میں ہونا جہاز کی صحت کے لیے بہت ہی خطرناک ہے اور مجھے یقین بلکہ ڈر ہے کہ ہماری ہنسی مذاق سے جہاز کا توازن ختم ہو جائے گا۔ اور جہاز ہچکولے کھاتے ہوئے شاید لاہور نہ پہنچ سکے لیکن نتیجہ میری توقعات کے خلاف نکلتا ہے کیونکہ پی آئی اے کے باتد بر عملے کو ہمارا علم ہو گیا ہے اسی لیے انھوں نے ہم لوگوں کو ایک دوسرے سے الگ تھلگ نشستیں فراہم کی ہیں۔"[17]

"عطیہ صاحبہ سچ مچ زندہ دل انسان ہیں جو اپنی زندہ دلی دوسروں میں منتقل کر کے میری طرح کے مردہ دلوں کو زندہ کرتی ہیں اُن سے ملاقات ایک یادگار ملاقات ہے۔"[18]

ہمارے معاشرے کا ایک اہم مسئلہ ضعیف الاعتقادی، جزبہ ایمانی اور توکل باللہ کی کمی اور جعلی پیروں فقیروں پر اندھا اعتقاد ہے۔ پاکستانی عطیہ سیدوں نے اس اہم اور حساس سماجی مسئلے کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے۔ سائنسی ترقی سے روحانی و اخلاقی زوال انحطط بڑھتا رہا ہے۔ توہم پرستی خصوصاً مشرقی معاشرے کا مزاج بن چکی ہے۔ اس کی کئی وجوہات ہیں۔ یہ امر حیران کن ہے کہ ذی شعور اور اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقے سے لے کر جہالت میں ڈوبے، کم پڑھے لکھے لوگوں کی کثیر تعداد جعلی پیروں کی مرید و مطیع ہے۔ "سرکار" کے معتقد، عقل سے عاری لوگ "معجزوں" کی حقیقت سے ناواقف ہیں۔ مذہب کی آڑ میں روحانیت کا ڈرامہ رچانے والے اپنے جاہ و جلال اور ظاہری انداز و اطوار سے مرعوب کرتے ہیں۔ اس طرح نام نہاد گدی نشین لوگ حقیقی معنوں میں ولی اللہ اور خدا دوست لوگوں کی نیک نامی کو متاثر کرتے ہیں یہ انسان کے روپ میں شیطان صنف لوگ ہیں۔

افسانہ "خاموشی" میں بھی ایسے ہی پیر صاحب کی نشاندہی کی گئی ہے۔ جعلی پیر اپنے حالات تبدیل نہیں کر سکتے لیکن لوگوں کے مسائل کے حل کرنے کی دعوے دار ہیں۔ ہمارے ہاں جہالت کا یہ عالم ہے کہ جوان لڑکیوں کے جسمانی اور جنسی تقاضوں کو سمجھانے کی کوشش نہیں کی جاتی۔ ہیسٹریا کے دوروں کو جنات کے آنے پر محمول کر کے خود ساختہ نتائج بر آمد کر لیے جاتے ہیں۔ ایسی لڑکیاں جعلی پیروں کے ہاتھ چڑھ کر عصمتیں گنوا بیٹھتی ہیں۔ یہ بات حیرت انگیز طور پر مضحکہ خیز معلوم ہوتی ہے کہ آدھی دنیا پر طاقت اور دولت کے بل بوتے پر

حکمرانی کرنے والی امریکی قوم بھی ضعیف الاعتقادی کا شکار ہے۔امریکہ میں تیرہ کا ہندسہ منحوس سمجھا جاتا ہے۔ اس لئے وہ بلند و بالا عمارتیں تو بنا لیتے ہیں لیکن تیرہویں منزل کا بورڈ نہیں لگاتے۔

بیش تر کردار شکوک و شبہات میں مبتلا نظر آتے ہیں، مثلاً افسانہ "دو چڑیاں" میں فواد کا کردار بھی ذہنی کشمکش کا شکار ہے۔اس کی بیوی نظمیں اور افسانے لکھا کرتی ہے مگر فواد کو یہ سب پسند نہیں ہے۔اس نے فہمیدہ پر نظمیں اور افسانے لکھنے پر پابندی لگا دی پر وہ چھپ چھپ کر لکھنے لگی مگر لکھنے کے بعد ان تحریروں کو ردی میں پھینک دیتی۔ فواد اس سہمی سہمی اور خاموش لڑکی سے نفرت کرنے لگتا ہے۔ایک دن فہمیدہ کی ردی میں پھینکی ہوئی کچھ تحریروں کو پڑھتا ہے اور یہ گمان کرتا ہے کہ یہ کوئی محبت نامہ ہے جو فہمیدہ نے اپنے کسی محبوب کو لکھا ہے۔اس پر وہ بھڑک اٹھتا ہے اور فہمیدہ کے بارے میں شکوک و شبہات میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

> "فواد نے بار بار اس نظم کو پڑھا، حتیٰ کہ اسے اس کے الفاظ حفظ ہو گئے۔ ہر مرتبہ اسے پہلے سے زیادہ اپنے اندر تناؤ او دباؤ محسوس ہوتا۔۔۔۔ یہ کون ہے جس کا دبی دبی، سہمی سہمی، کم گو اور اس نے نہایت کمینے پن سے ان صفات میں کم شکل کا بھی اضافہ، فہمیدہ سوچ رہی ہے۔۔۔۔ اندر ہی اندر کچھڑی پکا رہی ہے۔۔۔ یہ کون ہے جس کے بڑھتے قدموں کی آہٹ سننے کے لیے فہمیدہ۔۔۔۔ ایک بیاہتا عورت بے قرار ہے۔۔۔ یہ کون ہے جس تک شاید میرے سبب پہنچ نہیں سکتی۔۔۔۔ لیکن سارا وقت اس کے بارے سوچتی رہتی ہے۔"[19]

عطیہ سید کے افسانوں کے بیشتر کردار محبت کے مسئلوں میں الجھے ہوئے دکھائی دیتے ہیں مثلاً افسانہ "چھپکلی"، "اُڑتا پرندہ اور سنہری مچھلی"، آنسو کا نمک"، ایبل اور وہ"، "عشقِ تمام" اور "دائرہ" وغیرہ۔

افسانہ "چھپکلی" میں لڑکی حلوائی کے بیٹے سے محبت کرتی ہے۔ نتیجتاً حلوائی کا بیٹا بھی لڑکی کو خوب صورت سمجھ کر ہر روز سلائی سینٹر جاتے اس برقعہ میں لپٹے وجود کو اشتیاق بھری نگاہوں سے دیکھتا ہے۔لڑکی گھر آکر بستر پر لیٹتی تو وہ حلوائی کے بیٹے کی بھنورے کی طرح منڈلاتی نظروں کی یاد سے نہال ہو جاتی۔ وہ محبت

کے جذبے میں مست جب چھت پر موجود چھپکلی کو دیکھتی تو لڑکی کو اس پر بھی پیار آنے لگتا۔ایک دن لڑکی حلوائی کے بیٹے کی دکان پر جا کر اپنا نقاب الٹ دیتی ہے۔ لڑکے کا چہرہ اس کی بد صورتی دیکھ کر مرجھا جاتا ہے اور اپنے کام کرنے لگتا ہے۔ وہ لڑکے کے اس روّیے کو اپنی نسوانیت کی ہتک اور تذلیل سمجھتی ہے۔اس کو محسوس ہوتا ہے کہ اس کو دھتکار گیا ہے۔اس کے قلب وذہن میں ایک طوفان سا مچ جاتا ہے۔ وہ گھر آکر غصّہ اور تذلیل کے شدید جذبے کے تحت تڑپتی اور گھلتی رہتی ہے۔اس کے ساتھ ہی اس کی نظر چھت پر موجود چھپکلی پر پڑتی ہے اس کو چھپکلی سے بھی کراہت محسوس ہونے لگتی ہے۔ جس حقارت سے لڑکی کو ٹھکرایا جاتا ہے، لڑکی بھی اسی جذبے کے چھپکلی کو مار کر اپنا کتھارسس کرتی ہے۔

""""اگر اس کے جسم کو چھوا جائے تو یہ لجلجا بھی ہو گا" لڑکی نے تنفر سے سوچا۔
اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس کا ہاتھ سچ مچ چھپکلی کی نیم جاں لجلجے جسم سے مس ہو رہا ہو۔
اسے ابکائی سی محسوس ہوئی۔اسی بوکھلاہٹ میں وہ اٹھ بیٹھی۔ چھپکلی لڑکی کی اس غیر متوقع حرکت سے گھبرا گئی اور اپنی بچی کچھی توانائی اکھٹی کر کے ،اچھل کر فرش پر جا پڑی۔
اب وہ لڑکی کے پاؤں کے بالکل قریب پڑی تھی لڑکی نے امڈتے ہوئے غیظ و غضب میں نیم مردہ چھپکلی پر اپنا پاؤں رکھ دیا۔ چھپکلی پل بھر کو تڑپی اور پھر دم توڑ دیا لڑکی نے پاؤں ہٹا کر اسے دیکھا۔"[20]

افسانہ "اُڑتا پرندہ اور سنہری مچھلی" میں ارم کی نفسیاتی کیفیات اس طرح بیان کی گئی ہیں۔

"ایک طویل عرصے سے ارم نے اپنے اندر ایک لہر سی اٹھتی محسوس کی۔یہ عامر زکی تھا جس نے اس کے وجود کے تاروں کو مضراب سے چھیڑا تھا مگر ــــ عامر زکی ایک اا لجھی ہوئی ڈور کی مانند تھا جس کا کوئی سرا اس کے ہاتھ کی گرفت میں نہیں آتا تھا۔وہ کبھی تو اپنا اپنا لگتا ــــ گرم جوش اور شناسا، لیکن کبھی کبھی وہ اجنبیت کی دوری میں گم ہو جاتا، بعض اوقات وہ ارم کو شدت سے اپنے وجود کا احساس دلاتا اور ــــ بعض اوقات وہ اپنے

کیپسول میں بند ہو کر اسے فراموش کر بیٹھتا ــــ جیسے اس لمحے وہ ارم کی رسائی سے باہر

تھا۔"[21]

"آنسو کا نمک" میں شادی شدہ جوڑے کے درمیان ایک عجیب سا بندھن ہے۔ ان کے درمیان نظر نہ آنے والی دیوار حائل ہے۔ فہیم اپنی بیوی کے لیے محبت کے جذبات تو رکھتا ہے مگر اس کا اظہار نہیں کرتا۔ کیونکہ وہ ماضی میں بہت سی چیزوں کو کھوتا رہا ہے۔ وہ فراق اور ہجر کی دائمی کیفیت کو ہی اپنا مقدر سمجھ لیتا ہے وہ حال کو نظر انداز کر کے ماضی کی یادوں کے سہارے جینا چاہتا ہے۔ اس کے نزدیک ماضی ایک یاد کی صورت میں ہمیشہ ساتھ رہتا ہے جو کبھی بے وفائی نہیں کرتا۔ یوں وہ اپنی بیوی کے ساتھ بھی سرد مہری سے پیش آتا ہے۔ اور اپنے ہی خیالوں میں گم رہتا۔

"۔۔۔۔اس نے دزدیدہ نگاہوں سے فہیم کی طرف دیکھا۔ لیکن وہ اس کے وجود سے بے نیاز سڑک پر نظریں جمائے کار چلانے میں منہمک تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ سٹیرنگ ویل پر تھے، چمپئی آفتاب زدہ ہاتھ، جن میں اسے ہمیشہ ایک ناقابلِ بیان کشش محسوس ہوتی تھی۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ انھیں اپنے ہاتھوں میں لے کر سہلائے، ان پر اپنا رخسار رکھ دے، اور انھیں ایک پیار بھرا بوسہ دے مگر۔۔۔۔ اور اس نے پھر کنکھیوں سے فہیم کی طرف دیکھا۔ وہ دور کہیں کھویا ہوا تھا، کوسوں دور۔"[22]

عطیہ سید کے یہ تمام افسانے رومانی انداز کے ہیں۔ لیکن یہ رومانی فضاء پڑھنے والے کو خواب و خیال کی دنیا نہیں لگتی بلکہ اس میں حقیقی عنصر کارفرما نظر آتا ہے۔ اور یہ عطیہ سید کا وصف ہے کہ انھوں نے ان افسانوں میں حقیقی تجربات واحساسات کو رومانی لبادہ اُوڑھ کر پیش کیا ہے۔ الختصر ہم کہہ سکتے ہیں کہ عطیہ سید کے افسانے رومان اور حقیقت نگاری کا حسین امتزاج ہیں۔ اس حوالے سے اے بی اشرف اور سلمیٰ بینلی رسالہ "سپوتنک" میں لکھتے ہیں:

"زندگی کی تلخ حقیقتوں کو بھی عطیہ رومانوی انداز میں پیش کرتی ہیں۔ رومانیت کے عناصر ان کی سوچ کے انداز اور شاعرانہ اسلوب کے سبب پیدا ہوتے ہیں۔ادب میں رومانیت کی چاشنی اور دلکشی نہ ہو تو سپاٹ بن جاتا ہے۔"[23]

عطیہ سید کچھ کردار ایسے بھی لاتی ہیں جو ظاہری نمود و نمائش اور دکھاوے کو اہمیت دیتے ہیں۔اور اپنی دولت و شہرت کا دکھاوا کرتے اور اپنی انا کی تسکین کرتے نظر آتے ہیں۔ مثلاً افسانہ "شہرِ ہول" میں بشارت کا کردار جو عاصمہ کو محض دکھاوے اور اپنی انا کی تسکین کے لیے اپنا شہر دکھانا چاہتی ہے تاکہ عاصمہ پر واضح ہو سکے کہ وہ اتنے بڑے شہر میں رہتی ہے بشارت ڈی ڈی کولٹ کے پُر آسائش گھر کو ایسے انداز میں دکھاتی ہے جیسے یہ اِس کا اپنا گھر ہو۔اسی طرح مشہور بیٹل جان لینن کا شاندار محل نمائش،لایعنیت اور مجہولیت کی علامت ہے،اسی افسانے کا ایک اور کردار ماڈل کا ہے جو اب بوڑھی ہو چکی ہے مگر پلاسٹک سرجری سے پچیس سال کی دکھائی دیتی ہے۔وہ عاصمہ سے محض اپنی انا کی تسکین کے لیے اپنی عمر اور خوبصورتی کے بارے میں مختلف سوالات کرتی ہے تاکہ وہ مطمئن ہو سکے کہ کیا واقعی وہ اب بھی حسین اور کم عمر دکھائی دیتی ہے؟ ماڈل اور عاصمہ کے درمیان ہونے والی گفتگو میں ماڈل،عاصمہ سے سوال کرتی ہے۔

""تم نے مجھے دیکھا ہے؟"

"جی؟"میں نے استفہامیہ انداز میں کہا۔

"میرا مطلب ہے تم نے میرے چہرے کو نہیں دیکھا؟ نہیں؟ اچھا اب دیکھو۔ غور سے دیکھو۔۔۔

"مسئلہ کیا ہے؟ چلو تم خود ہی بتادو"

"کیا تمھیں میری آنکھوں کے گرد لکیریں نظر نہیں آرہی ہیں؟"

"نہیں تو۔"

"اچھا بتاؤ میری عمر کیا ہوگی اندازاً"

"یہی کوئی بیس کے پیٹے میں۔"

اس پر اس نے بے ہنگم قہقہہ لگایا۔۔۔"یہ ہوئی نا بات"

"کیا مطلب"

"یہی کہ تم میری عمر کا اندازہ نہیں لا سکیں۔ میں تو بوڑھی ہوں""24

افسانہ "آخری کہانی" میں جب ادیب حالتِ مرگ میں ہوتا ہے۔ اور بھوک کی شدت سے اس کا دم گھٹ رہا ہوتا ہے۔ اس وقت اس کا دوست طاہر اس سے ملنے آتا ہے۔ مگر اس وقت طاہر ادیب کی مدد کرنے کی بجائے اس سے یہ کہتا ہے کہ وہ مرنے سے پہلے اپنا نام مجھے دے جائے تاکہ میں اپنے افسانے ادیب کے نام سے چھاپ سکوں، طاہر یہ سب اس لیے کہتا ہے کہ اوّل تو جب ادیب کے نام سے تحریریں چھپیں گی تو سب اس کو ہاتھوں ہاتھ لیں گے اور اس کو مالی فائدہ ہو گا۔ اور دوسرا اس کی انا کو تسکین ملے گی کہ آخر اس کی تحریریں بھی چھپ گئیں۔ افسانہ "کرپکے اور چینی کمرہ" میں کرپکے نہایت ذہین و فطین شخص ہے۔ افسانہ "شمالی ستارہ" میں مس وارث کا کردار دُہری شخصیت کا عکس پیش کرتا ہے۔ مس وارث خواتین کالج میں تاریخ کی استاد ہیں۔ پختہ عمر ہیں۔ ان کی سادہ سنجیدہ اور پر وقار شخصیت سے سب طالبہ متاثر تھیں۔ بلال اس کالج میں کلرک کی حیثیت سے فرائض سرانجام دے رہا تھا۔ بلال کے دل میں بھی مس وارث کے لیے تقدس کا ایک نامعلوم جذبہ پیدا ہو گیا۔ وہ مس وارث کا ہر کام کر کے دلی خوشی محسوس کرتا ہے۔ پھر ایسا ہوا کہ مس وارث کو سعودی عرب میں ملازمت مل جاتی ہے اور وہ دو سال کی چھٹی لے کر چلی جاتی ہیں۔ دو برس بعد جب وہ واپس آتی ہیں تو ان کی دیانتداری اور زہد و تقویٰ میں اضافہ ہو چکا تھا۔ وہ بڑی سفید چادر اوڑھ کر رکھتی تھیں اور ہر وقت تسبیح پڑھتی رہتی۔ یہ سب دیکھ کر بلال کے دل میں مس وارث کے لیے احترام کے جذبات نے مزید شدت اختیار کر لی۔

سماجی مطالعہ

ادب سماج کی عکاسی پوری جمالیاتی رعنائیوں کے ساتھ کرتا ہے۔ جدید زمانے کے تقاضوں اور انسانی شعور وارتقا کے پیشِ نظر جدید ادبی اصنافِ نثر میں افسانہ نگاری کو خاص مقام حاصل ہے۔ زمانی ارتقا اور وقت کے اختصار کے پیش نظر داستان سے افسانے نے جنم لیا اور یورپ سے اُردو میں وارد ہوا۔ برصغیر پاک و ہند میں تبدیلیاں رونما ہوتی رہیں۔ آخر میں جدید افسانہ متعارف ہوا۔ عطیہ سید جدید افسانہ نگار ہیں۔ اس صنف میں ان کا مقام منفرد ہے۔

عطیہ سید کی کہانیاں حقیقی زندگی کی عکاّس ہیں۔ ان کے افسانوں میں تازگی کا احساس، نئے پہلو، حقیقت نگاری اور تکنیک کے نئے تجربات ملتے ہیں۔ عطیہ سید اپنے معاصر افسانہ نگاروں میں منفرد و ممتاز مقام رکھتی ہیں۔ ان کے افسانوں میں جدید دور کے انسان کا المیہ نظر آتا ہے۔ عورت کے دکھ، طبقاتی کشمکش، جبر کا احساس اور جبر کے خلاف پیدا ہونے والے ردِ عمل اور انسان کے اندر چھپے رنج و غم کا اظہار ان کے خاص موضوعات ہیں۔

> "عطیہ سیّد نے مختلف ممالک اور معاشروں کی کہانیاں لکھی ہیں۔ ایسا تجربہ اردو میں باقاعدہ طور پر پہلی بار ہوا۔"[25]

عطیہ سید کے افسانوں میں شعور، لاشعور اور شعور کی رو کا عام استعمال ملتا ہے۔ وہ اپنی کہانیوں میں ایسی فضا قائم کرتی ہیں جو قاری کو اپنے سحر میں گرفتار کر لیتی ہے۔

ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا لکھتے ہیں:

> " عطیہ سید کے افسانوں میں متعدد خصوصیات پڑھنے والے کی جاذب توجہ ہیں۔ واقعات، فضا بندی اور کردار نگاری کے علاوہ افراد کی داخلی نفسیاتی کشاکش کو بڑی کامیابی سے پیش کیا گیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ حیات و کائنات کے بارے میں ایسے سوالات اٹھائے گئے ہیں جو بنیادی ہیں۔ چناچہ ہم افسانوں کی فنی خصوصیات سے متاثر

ہونے کے ساتھ ساتھ سوچنے پر بھی مجبور ہو جاتے ہیں، اور ان کی تخلیقیت کی سطحیں ہمارے وژن کو بھی وسیع کرتی ہیں۔ یہی عطیہ سید کی کامیابی کی دلیل ہے۔"[26]

عطیہ سید کے افسانے سماجی حقیقت نگاری کا عمدہ مرقع ہیں۔ ان کے افسانوں میں سماج کے اندر موجود نچلے طبقے کے افراد کے مسائل کی واضح جھلک موجود ہے۔ ان کی کہانیوں میں ٹھنڈک اور متانت کا احساس ہوتا ہے۔ انھیں اپنے افسانوں پر پوری دستگاہ حاصل ہے انھوں نے تہہ در تہہ اپنے افسانوں کی تعمیر کی اور بامعنی سماجی شعور سے لبریز تخلیقی افسانے لکھے۔ عطیہ سید نے متوسط طبقے کی اخلاقی، معاشی اور ذہنی زندگی کی بہترین تصویریں پیش کیں۔ انھوں نے مشرقی اور مغربی معاشرے میں موجود اقدار پر جارحانہ طور پر طنز کیا۔ احمد ندیم قاسمی رقم طراز ہیں:

"عطیہ سید نے فی الواقع بیدی اور کرشن چندر کی روایت کو زندہ رکھا۔ وہ ایک زندہ فکشن نگار کے طور پر سامنے آئیں۔ انھوں نے کہانی کو بھی زندہ رکھا اور روایت کو بھی۔"[27]

ڈاکٹر آغا سہیل کے مطابق:

"کرشن چندر نے افسانے کی فنی تکنیک میں وہ نقطہ دریافت کر لیا ج، جس پر منٹو افسانے کا ڈھانچہ قائم کرتا ہے۔۔۔۔ وہ ایک دائرہ کھینچ کر نقطہ عروج تک قاری کو پہنچا کر افسانہ مکمل کر دیتا ہے۔ یہی فنکاری عطیہ سید کا سرمایہ ہے جس کی لطافت عام قاری کی نگاہ میں سے مخفی رہتی ہے۔ اور جس کی تکمیل پر قاری کو روشنی نظر آ جاتی ہے۔"[28]

ان کے افسانوں میں مرکزی کرداروں کے ساتھ ثانوی کردار بھی سامنے آتے ہیں۔ ان کرداروں کا خاکہ کہیں مختصر اور کہیں تفصیل سے بیان کرتی ہیں۔، مگر دونوں صورتوں میں وہ کسی قسم کی مشکل کا شکار نہیں ہوتیں۔ وہ ان کرداروں کا تعارف اس انداز میں کرتی ہیں کہ کرداروں کی مکمل شخصیت کھل کر سامنے آ جاتی ہے۔ مثلاً افسانہ "" "چھے بجے کی خبر" میں سسٹر ٹریزا جب سڑک پر جا رہی ہوتی ہیں۔ تو وہاں وہ جن تین لفنگوں کو دیکھتی ہیں۔ ان کا تعارف عطیہ سید اس طرح کرواتی ہیں۔

"سسٹر ٹریزا دیکھتی ہے کہ ۔۔۔ ان میں سے ایک تو ریڈ انڈین فرسٹ مون ہے۔ دوسرا حبشی ٹام ہسلر اور تیسرا السلواڈور کا مہاجر کارلوس۔

فرسٹ مون ایک انڈین Reservation سے مفرور ہے۔ فرسٹ مون نے سانس لینے کے لیے۔۔۔ سینے کی گھٹن سے آزاد ہونے کے لیے سفید فاموں کے شہر لاس اینجلس کا رخ کیا۔ غیر تعلیم یافتہ ہونے کی وجہ سے کوئی روزگار میسر نہ آسکا۔۔۔ آج کل بھی وہ منشیات کے کاروبار میں ملوث حلقوں میں نقل و حرکت کرتا ہے۔

حبشی ٹام ہسلر چھ فٹا کڑیل نوجوان ہے۔ اس کی آبنوسی رنگت میں آنکھوں اور دانتوں کی سفیدی کچھ زیادہ ہی جگمگاتی ہے، چہرے کے نقوش میں سب سے موثر آنکھیں ہیں۔ جن میں سے چنگاریاں سی پھوٹتی محسوس ہوتی ہیں۔"[29]

عطیہ سید کے افسانوں میں عورت بیوی، بیٹی اور بہن کے روپ میں سامنے آتی ہے۔ افسانہ "دو چڑیاں" میں لڑکی کی شادی کا مسئلہ بیان کیا گیا ہے۔ عطیہ سید نے اس کہانی میں بے جوڑ شادی کا المیہ پیش کیا ہے۔

"جب فہمیدہ کہتی کہ شام کا سنی ہے تو فواد کو اس کی بصات پر شک گزرتا۔۔۔ جب میز پر بیٹھی مکھی اسے پلیٹ میں دکھائی دیتی تو فواد اسے نارمل سمجھنے کو تیار نہیں تھا۔۔۔ جب وہ بتاتی کہ تارِ عنکبوت نے اسے چاروں طرف سے لپیٹ رکھا ہے اس کا پارہ آہستہ آہستہ چڑھنے لگتا۔ شادی کے ابتدائی دنوں کی مٹھاس کڑواہٹ میں تبدیل ہونے لگتی۔ جب فہمیدہ اس کی طرف اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے دیکھتی تو اسے یہ احساس شدت سے اپنی لپیٹ میں لے لیتا کہ وہ اسے پھر بھی دکھائی نہیں دے رہا۔ اس وقت اس کا جی چاہتا کہ وہ لفظوں سے مجسم، کاغذ میں ملبوس میں لپٹی اس عورت کے پُرزے اُڑا دے۔"[30]

اسی طرح افسانہ "چھپکلی" میں لڑکی کی نفسیات دیکھیے:

""مردود، نابکار!" لڑکی بولی اور پھر کسی شدید جذبے کے تحت چھپکلی کے مردہ جسم پر اپنے جوتے سے وار کیا۔ چھپکلی کے جسم کے دو تین ٹکڑے ہوئے اور فرش پر بکھر گئے۔"31

عطیہ سید نے بعض مقامات پر فینٹسی سے کام لیا ہے۔ وہ معلوم سے نامعلوم تک کا سفر کروا کر حیرت کی اتھاہ گہرائیوں میں لے جاتی ہیں۔ اس عمل میں وہ موجودہ لمحات کے اندر چھپی حقیقتوں کو انسانی فطرت کے ساتھ ہم آہنگ کر کے اس طرح پیش کرتی ہیں کہ یہ فرضی زندگی کی کہانی، اصل زندگی کے مقابلے میں زیادہ بہتر اور پُرکشش محسوس ہونے لگتی ہے۔ قاری جب ان کہانیوں میں موجود مسائل کا ادراک کرتا ہے تو وہ آیندہ کی مشکلات سے لڑنے کے لیے لاشعوری طور پر تیار ہو جاتا ہے۔ ڈاکٹر بشیر احمد سوز کے مطابق:

"عطیہ سید کہانی کو اس سلیقے اور عمدگی سے شروع کرتی ہیں کہ تنکا تنکا آشیانہ کب بنتا ہے پتا ہی نہیں چلتا اور سحر کا اثر شروع ہو جاتا ہے۔ عطیہ سید کے افسانے دھیمی آنچ پر پکتے ہیں اور بھاپ سے ان کے کردار بنتے ہیں۔"[32]

عطیہ سید کی زیادہ تر کہانیاں امریکن طرزِ زندگی اور اس کے سماج کے گرد گھومتی دکھائی دیتی ہیں۔ عطیہ سید نے امریکن طرزِ زندگی اور وہاں کی تہذیب کو کمال خوبی سے اپنے افسانوں میں پیش کیا ہے۔ ان کہانیوں کو پڑھنے کے بعد قاری امریکن طرزِ زندگی اور وہاں کے باشندوں کے نفسی عوامل آسانی سے جان سکتا ہے۔ ان کہانیوں کے کچھ کردار وہاں کے ترقی یافتہ معاشرے کی عکاسی کرتے نظر آتے ہیں جبکہ کچھ کردار سماجی سطح پر زوال پذیر اور شکست و ریخت کی نمایندگی کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ یوں ان کے ہاں سماجی شعور کا واضح احساس اُبھر کر سامنے آتا ہے۔ ڈاکٹر خواجہ محمد ذکریا "دشت، بارش اور رات" پر ایک تقریب میں یہ مضمون پڑھا:

"جب سے عطیہ سید کے افسانے اُردو رسائل میں شائع ہو رہے ہیں، اسی وقت سے انھوں نے سنجیدہ قارئین کو متوجہ کیا ہے۔۔۔۔ اور اب اکیسویں صدی کے آغاز میں ان کے افسانوں کا نیا مجموعہ منظرِ عام پر آیا ہے۔ جو صنفِ افسانہ پر ان کی مہارت کا مزید ثبوت فراہم کرتا ہے۔"[33]

عطیہ سید افسانہ "میری میرا" میں ایک جگہ لکھتی ہیں۔

"۔۔۔ جدید سفید فام امریکہ کا خمیر دو قسم کی ذہنیتوں کا امتزاج ہے۔ یعنی جرم اور مذہبیت۔"[34]

افسانہ "برگزیدہ"

"یہ کرسٹینا کا صدیوں کا احساس کمتری بول رہا تھا۔ شاید وہ اب بھی پہلے کی کسی جنونی پلانٹیشن پر کام کرنے والی زر خرید غلام تھی۔ معاشرتی تاریخی عمل نے اس کا جسم تو آزاد کروالیا تھا، لیکن اس کی روح ہمیشہ کے لیے گروی رکھی جاسکتی تھی۔ اسے در حقیقت اپنے آپ سے نفرت تھی، اور سیاہ فام مرد اس کا اپنا ہی عکس تھا۔ سو اس سے یگانگت کیسی؟"[35]

عطیہ سید نے امریکن طرزِ زندگی اور تہذیب کا جس طرح عکس پیش کیا ہے اگر اس کا نفسیاتی سطح پر مطالعہ کیا جائے تو ہمیں معلوم ہو گا کہ وہاں کے باشندے نفسیاتی طور پر خوفزدہ ہیں۔ جدید ترقی یافتہ دور میں امریکی باشندے مادیت پرست ہو چکے ہیں۔ ان کے نزدیک رشتوں کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہیں۔ انسانیت سے ان کا دور دور تک کوئی واسطہ نہیں رہا۔ کوئی سڑک کے بیچ مر رہا ہو امریکی قطع بے نیازی سے اس منظر کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے کے باوجود خاموشی سے گزر جائیں گے۔ جیسے انھوں نے کچھ دیکھا ہی نہیں۔

"وہاں مجھے یہ شعور نہ تھا کہ زندگی کی اصلیت دکھ ہے، وہاں میرا خیال تھا کہ تفریط سے سب اذیتیں پھوٹتی ہیں، مگر یہاں آکر یہ راز کھلا کہ افراط کے باوجود انسان عذاب جھیل رہے ہیں، آشوب سے گزر رہے ہیں تب مجھ پر منکشف ہوا کہ زندگی کا اصل اصول شاید کرب ہی ہے۔"[36]

افسانہ "کرسمس کی شب" میں ایک طوائف کا کردار دکھایا گیا ہے۔ جو بے مہری حالات اور سماجی نا انصافی کے سبب اپنا جسم بیچنے پر مجبور ہے۔ عطیہ سید نے اس کردار کا نفسیاتی تجزیہ کر کے قاری کو بتانے کی کوشش کی ہے کہ انسان فطری طور پر ایسا نہیں ہوتا یہ سماج ہی ہے جو انسان کو صحیح کی بجائے غلط راہ پر ڈال دیتا ہے۔

عطیہ سید کے ان افسانوں کے مطالعے کے بعد یہ بات سامنے آتی ہے کہ وہ دنیا کہ دکھ، درد اور تکلیفوں کو قریب سے محسوس کرتی ہیں۔ جب وہ دنیا کو اداسی اور پریشانی کی حالت میں دیکھتی ہیں تو یہی اداسی اور المنا کی ان کے افسانوں میں در آتی ہے۔ بظاہر عطیہ سید کے افسانوں میں خوشی کی کیفیت کم ہے۔ اس کے باوجود خوش ہونے اور خوش رکھنے کی کوشش جابجا ملتی ہے۔ مثلاً اگر ایک طرف عطیہ سید نے افسانہ "شہرِ ہول" میں یہ کہا کہ زندگی کا اصل واصول کرب ہے اور دکھ ازلی وابدی ہے تو دوسری طرف افسانہ "خزاں میں کونپل" کا اختتامیہ انسانی امیدوں کا لافانی افق ہے

اقتصادی مطالعہ

عطیہ سید اپنی تخلیقات میں ایک واضح مقصد رکھتی ہیں۔ وہ سماج کے دکھوں، تکلیفوں اور پریشانیوں کو اپنی ایک خاص آنکھ سے دیکھتی ہیں۔ ان کی کہانیاں ہمارے معاشرے سے ماورا قسم کی نہیں بلکہ ہمارے معاشرے کی ہی تلخ حقیقتوں کو سمیٹ کر لکھی گئی ہیں۔ ان کی بیشتر کہانیاں امریکن طرزِ زندگی کی ترجمانی کرتی ہیں لیکن ان سب کے باوجود انھیں پاکستانی معاشرے سے بھی جوڑا جا سکتا ہے۔ اگرچہ عطیہ سیّد کے زیادہ تر کردار مغربی تہذیب اور معاشرت کے پروردہ ہیں لیکن وہ مشرقی کرداروں کو بھی نظر انداز نہیں کرتیں۔ اس حوالے سے ڈاکٹر مرزا حامد بیگ لکھتے ہیں:

> "اِن کے اکثر افسانوں کا منظر نامہ امریکہ کی سرزمین سے تشکیل پاتا ہے لیکن کرداری سطح پر ان کا ایک آدھ مشرقی کردار اپنے معاشرتی یا تاریخی حوالوں کے ساتھ ایک ایسا پل تعمیر کر دیتا ہے جہاں سے دونوں اطراف کی دنیا دیکھی جا سکتی ہے"۔ [37]

عطیہ سید نے اپنے مخصوص انداز میں معاشرے کے عام روّیوں کو اور خاص کر غربت اور نسوانی استحصال پر بات کی ہے۔افسانہ " تتلی "اور "شہر ہول"""کر سمس کی شب"""آخری کہانی "اور "ایک عام معمولی آدمی" اس کا واضح ثبوت فراہم کرتا ہے کہ عطیہ سید نچلے اور متوسط طبقے کے لیے درد مند دل رکھتی ہیں۔اس حوالے سے ڈاکٹر اے بی اشرف اور سلمی بینلی لکھتے ہیں:

"عطیہ سیّد کی خوبی یہ ہے کہ وہ ایک چھوٹے سے واقعے یا کسی معمولی انسانی رویے کو لے کر ایک اچھی کہانی تیار کر دیتی ہیں۔ نفسیاتی رویوں سے عطیہ کی دلچسپی بھی ان کہانیوں سے ظاہر ہوتی ہے۔"[38]

افسانہ " تتلی "میں غربت کی انتہائی دردناک تصویر دکھائی گئی ہے۔ یہ کہانی ایک حسنی نامی لڑکے کی ہے جو انتہائی غریب گھرانے میں پیدا ہوا۔ جو عمر حسنی کے پڑھنے کی تھی اُس عمر میں اس کا سوتیلا باپ اس کو مکئی کے دانے بیچنے کو کہتا ہے۔ حسنی پورا دن دانے بیچتا ہے مگر امیر گاڑیوں والے انھیں نہیں خریدتے۔ ایک سائیکل کی ٹکر سے حسنی کے سارے دانے نہر میں گر جاتے ہیں۔ حسنی اس ڈر سے گھر نہیں جاتا کہ اس کا سوتیلا باپ اس کو بہت مارے گا۔ وہ سارا دن اور رات اسی جگہ گزار دیتا ہے۔ صبح جب حسنی کو بھوک ستاتی ہے تو وہ کوڑے کے ڈھیر کے پاس کھانے کی کوئی چیز تلاش کرتا ہے۔ وہاں اس کو کچھ نہیں ملتا۔ آخر اس کی نظر ایک خوبصورت تتلی پر پڑتی ہے۔ وہ غربت کی وجہ سے مجبور ہو کر تتلی کو نگل لیتا ہے۔ حسنی کی غربت کو عطیہ سید اس طرح بیان کرتی ہیں۔

"اسے بھوک کی شدت نے بے چین کر رکھا تھا وہ کوڑے کے ایک ڈھیر کو پر امید نگاہوں سے تکنے لگا۔ شاید کوئی ایسی چیز مل جائے جس سے وہ اپنے پیٹ کے جلتے دوزخ کی آگ کسی حد تک ٹھنڈی کر سکے

یکدم اس نے۔۔۔۔۔۔ تتلی کو دیکھا۔ وہ چڑھتے سورج اور پھیلتی میں کس قدر خوشنما دکھائی دے رہی تھی۔

حسنی تتلی کے حسن سے دم بخود انہی سوچوں میں گم تھا کہ اس کی انتڑیوں کو بھوک کے آہنی جبڑوں نے رگیدنا شروع کر دیا۔۔۔پہلے سے بھی زیادہ شدت سے۔اچانک اس کے اندر غاروں میں رہنے والا قدیم انسان جاگنے لگا جو اپنی بھوک مٹانے کے لیے چھپکلیوں کو ہڑپ کر لیتا تھا۔وہ اس کی طرف جھپٹا اور خوشنما تتلی کو اپنے ہاتھ میں جکڑ لیا۔ اور پھر اس کی خوبصورتی اور بے بسی کا خیال کیے بغیر اسے منہ میں ڈالا اور ایک دو مرتبہ چبانے کے بعد نگل گیا۔"[39]

عطیہ سید نے امیر اور غریب طبقے کے فرق کو اپنے افسانوں میں واضح کیا۔افسانہ "شہرِ ہول" میں ایک طرف ڈی ڈی کولٹ اتنا امیر ہے کہ وہ انتہائی شاندار عمارت میں اکیلا رہتا ہے تو دوسری طرف مسز فان کریمر اتنی غریب ہے کہ وہ گتے کے ڈبے میں رہنے پر مجبور ہے۔وہ بوڑھی ہو چکی ہے وہ موسم کی شدت برداشت نہیں کر پاتی اور مر جاتی ہے۔

اسی طرح افسانہ "کرسمس کی شب" کا ایک کردار روزانا ہے۔جو کہ ایک طوائف ہے۔جو اپاہج بھی ہے اور غربت کی وجہ سے اپنا جسم بیچنے پر مجبور ہے۔ جنسی انفرادی نہیں بلکہ سماجی مسئلہ ہے۔جب کوئی عورت اپنا جسم بیچنے پر مجبور ہو جائے تو اس کا موردِالزام سماج کو ٹھہرایا جانا چاہیئے۔کیونکہ سماج ہی عورت کو یہ انتہائی قدم اٹھانے پر مجبور کرتا ہے۔اس میں خود اکیلی عورت قصوروار نہیں ہوتی۔پورا سماج اس کا ذمہ دار ہے۔

افسانہ "آخری کہانی" میں ایک اہم تلخ سچائی کو افسانے کا موضوع بنا کر اس کے مختلف پہلوؤں کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔یہ موضوع ادیبوں شاعروں اور فنون لطیفہ سے وابسطہ لوگوں کی ناقدری ہے۔اس میدان سے تعلق رکھنے والوں کو مناسب پذیرائی نہ ملنے کی وجہ سے غربت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔جذباتی شکست وریخت ان کی فنکارانہ اور خلاقانہ صلاحیتوں کو زنگ آلود کر دیتی ہے۔عطیہ سید نے اپنے افسانوں میں فنون لطیفہ سے تعلق رکھنے والے افراد کی ناداری، مفلسی، بھوک، اور مفلوک الحالی کا نقشہ کھینچا ہے۔فاقوں کی زد میں رہنے والے جسم وروح پر کچوکے سہتے ہیں۔باغیانہ اور بلند آہنگ لہجہ اختیار کرتے ہوئے انقلاب کی نوید سناتے، لوگوں کے حق

میں نعرے بلند کرتے ہیں۔اُن کے قلم ناانصافی اور ظلم کے خلاف زہر اگلتے ہیں۔ادیب معاشرے کو آئینہ دکھاتے ہیں لیکن اُن کی اپنی حالتِ زار قابل رحم ہوتی ہے۔

افسانہ آخری کہانی'' میں ایک ادیب کی غربت کو دکھایا گیا ہے۔اس کو نشے کی لت بھی لگی ہوئی ہے۔نشے کے استعمال سے وہ بہت بیمار ہو جاتا ہے اور ہسپتال پہنچ جاتا ہے۔وہاں پر موجود ڈاکٹر اس کو ایک عام معمولی آدمی سمجھ کر اس کے ساتھ عجیب برتاؤ کرتا ہے لیکن ادیب بھی ڈاکٹر کی ہر بد تمیزی کا برابر جواب دیتا ہے۔اور سوچتا ہے کہ اگر یہ معالج اگر شہر کا مانا ہوا ڈکٹر ہے تو میں بھی تو اعلیٰ پایے کا ادیب ہوں۔مگر یہ بدذوق ڈاکٹر اس کو نہیں جانتا،اور اس بات سے واقف نہیں کہ مجھ جیسا ادیب صدیوں میں پیدا ہوتا ہے۔ڈکٹر اس کو بتادیتا ہے کہ اب وہ زیادہ دن جی نہیں سکے گا لہذا وہ گھر چلا جائے۔ادیب گھر چلا جاتا ہے۔اس کو بھنگ کی شدید ضرورت محسوس ہوئی مگر اس کے پاس پیسے نہیں ہوتے کہ وہ بھنگ خرید سکے اس کا پرانا دوست طاہر اس سے ملنے آتا ہے طاہر کو افسانہ نگار بننے کا بہت شوق ہوتا ہے مگر وہ ادیب کو کہتا ہے کہ وہ تو ویسے بھی مر رہا ہے جاتے ہوئے اپنا نام مجھے دے جائے تب ادیب کو احساس ہوتا کہ وہ کتنا سستا آدمی ہے۔لے دے کے میرے پاس ایک نام ہی ہے اور وہ بھی اس کا دوست اس سے چھیننا چاہتا ہے۔وہ سوچنے لگتا ہے کہ ساری زندگی اس نے اتنا نام کمایا،اتنی شہرت حاصل کی مگر اس سے اس کو کیا حاصل ہوا؟دو وقت کی روٹی بھی نہیں کھا سکتا۔ایسی شہرت کا کیا فائدہ؟کہ آج وہ بھوکا مر رہا ہے اور کسی کو اس کی پرواہ تک نہیں۔ہر عروج کے بعد زوال ہے اور یہی اس کے ساتھ ہوا کہ وہ اتنا مشہور ہونے کے بعد بھی آج بھوک اور بیماری کی حالت کی وجہ سے مر جائے گا۔

عطیہ سید نے اس افسانے میں جعلی اور جھوٹے ادیبوں کا پول بھی کھولا ہے۔منافقت،سفارش،اقربا پروری نے اخلاقی و سماجی اقدار کو کھوکھلا کر دیا ہے۔علم و ادب کے میدان میں بھی یہ بیماریاں سرایت کر چکی ہیں۔ اعلیٰ وارفع خیالات و کردار کے مالک،صاحب علم،دانش ور،انسان دوست قلم کاروں کی بجائے پامال اور فرسودہ خیالات کے حامل نام نہاد انٹلیکچوئیل کامیاب و کامران ہیں۔بے تاثیر باتیں لکھنے والے غبی،سپاٹ ذہن کے

ساتھ دوسروں کے خیالات اور الفاظ مستعار لے کر ادبی قدر بڑھانے میں کوشاں اور اس بات پر مصر رہتے ہیں کہ ان کی تخلیق کو آسمانی صحیفے کے مترادف سمجھا جائے۔اس افسانے میں طاہر کا کردار اسی نوعیت کا ہے۔

جن ادیبوں اور شاعروں کے تعلقات عامہ کا شعبہ مضبوط ہوتا ہے ان کے لیے کامیاب ہونا مشکل نہیں۔کچھ خواتین لکھاری ادائیں ناز و نخرہ دکھا کر اور منفی ہتھکنڈے استعمال کر کے شہرت کی سیڑھی چڑھتی ہیں۔ان حربوں سے اصل حق دار کا حق مارا جاتا ہے۔کچھ ادیب اپنے خیالات وافکار اور لفظ رہن رکھوا دیتے ہیں۔موم کی کٹھ پتلی کی طرح اُن سے پبلی شرز، ایڈیٹر حضرات ایسی چیزوں لکھوانا چاہتے ہیں جو ہاتھوں ہاتھ بکیں۔ادیب اپنے منصب کو بھلا کر فرائض سے پہلو تہی کرتے ہیں۔

عطیہ سید ایک حساس، باعلم اور باشعور ادیبہ ہیں۔وہ ملکی حالات پر مستحکم سیاسی اور معاشرتی نظریات رکھتی ہیں۔مثلاً افسانہ "درویشِ رقصاں" کراچی کے موجودہ حالات پر لکھا گیا ہے۔اس کے علاوہ افسانہ "ہمیں قتل ہو آئیں یاروں چلو" صحافت کی دنیا کی کہانی ہے۔عطیہ سید ملکی صورتِ حال کے علاوہ عالمگیر پیمانے پر اقدار میں افراتفری اور تہذیب کی پامالی سے جو تباہی پیدا ہوئی اور امن و سکون کی فضا جس طرح منتشر ہوئی اور اس سے انسانی رشتوں پر انفرادی اور اجتماعی اثرات مرتب ہوئے، ان کی فلسفیانہ توجیح و تشریح پیش کرتی ہیں مثلاً افسانہ "ذکر اُس پری وش کا" میں 9/11 کے حالات وواقعات کو عطیہ سید نے طنزیہ اور مزاحیہ انداز میں پیش کیا ہے۔

وہ انسانی تاریخ اور تہذیب کو انسانی نفسیات کے حوالے سے سمجھانے کی کوشش کرتی ہیں مثلاً افسانہ "بلقیان کابت" میں جنگی صورتحال میں ہونے والے سیاسی اور اقتصادی حالات کو عطیہ سید اس طرح بیان کرتی ہیں۔

"۔۔۔۔۔ہمارے پاس اتنے پیسے کہاں کہ اس کی مرمت کر سکیں۔تمھیں معلوم ہے کہ یہاں برسوں سے جنگ جاری ہے۔ہم طوائف الملوکی، بدحالی اور قحط سالی کا شکا ہیں۔ ہمارے لیے زندگی اور موت یکساں ہے۔ہمارے بچے پیدا ہوتے ہی مرنا شروع ہو جاتے ہیں۔۔۔خوراک کی کمی اور علاج معالجے کے نہ ہونے کی بنا پر۔ہماری عورتیں

جوان ہوتے ہی بوڑھی ہو جاتی ہیں۔ مرد بلوغت کی عمر میں داخل ہوتے ہی درندہ صفت بن جاتے ہیں۔ ان کے ہاتھوں میں کلاشنکوف اور راکٹ ہوتے ہیں۔ ان کی آنکھوں میں وحشت اور پیٹ میں بھوک کی بھٹی جلتی ہے۔ انھیں ہر چیز سرخ دکھائی دیتی ہے۔ وہ نہیں جانتے کہ گلاب سرخ ہوتے ہیں۔ انھیں صرف یہ معلوم ہے کہ لہو کا رنگ سرخ ہے۔ ان کے کان موسیقی سے نہیں بلکہ بموں کے دھاکوں سے آشنا ہے۔"[40]

ان کے بیشتر افسانے امریکن تہذیب و سماج کا آئینہ ہیں۔ امریکن طرزِ زندگی کو جس خوب صورتی اور فنکارانہ مہارت کے ساتھ عطیہ سید نے اپنی تحریروں میں سمویا ہے۔ وہ انھیں کا حصّہ ہے۔ ان کے افسانوں میں جابجا امریکن طرزِ زندگی کی جھلکیاں دیکھی جاسکتی ہیں۔ مثلاً افسانہ "عشقِ تمام" میں امریکن فربہ اندام لڑکی ایک کلاس فیلو جیری میں دلچسپی لینے لگتی ہے۔ جیری نسوانیت اور نرگسیت کا شکار ہے۔ وہ عورت اور مرد کے درمیان کی چیز ہے۔ جیری امریکن لڑکی کو مسلسل نظر انداز کرتا ہے مگر اس کے باوجود امریکن لڑکی اس پر فریفتہ ہے۔

"میں نے امریکی لڑکی کو پریشان دیکھ کر اپنے ساتھ کافی پینے کی پیشکش کی۔ وہ تیار ہو گئی۔ جب میں اور وہ چودھویں سٹریٹ پر واقع کافی شاپ پہنچے تو دروازے میں سے جیری اور اس کا دوست برآمد ہوئے، انہوں نے ایک دوسرے کا ہاتھ تھام رکھا تھا اور ایک دوسرے کی قربت کے باعث بے خودی کے عالم میں دنیا مافیہا سے بے خبر تھے۔ لہذا انہوں نے ہماری طرف کوئی توجہ نہ دی۔ باہر فٹ پاتھ پر نکل کر جیری نے اپنے دوست کے اوور کوٹ کا کالر بڑی ادا سے ٹھیک کیا۔ جواب میں دوست نے بھی اس کے لبوں پر بوسہ دیا۔ پھر اس نے جیری کی پتلی کمر کے گرد بازو ڈالا اور دونوں ایک دوسرے سے لپٹے ہوئے فٹ پاتھ پر چلنے لگے۔"[41]

اس افسانہ سے امریکن طرزِ زندگی کا یہ پہلو سامنے آتا ہے کہ امریکہ میں اس طرح کے تعلقات کا عام رواج ہے، وہاں اس کو معیوب نہیں سمجھا جاتا۔ اسی طرح افسانہ "شہر ہول" میں عطیہ سید امریکہ کے شہر کی حالت کا نقشہ کھینچتے ہوئے کہتی ہیں۔

"ہاں Bronx جلتی عمارتوں کی راکھ کا ڈھیر، جہاں بے شمار لوگوں کو زندہ جلا دیا گیا
کیونکہ ان عمارتوں کے مالکان انہیں خالی کروانا چاہتے تھے لیکن ان کے مکین جنہیں
قانونی تحفظ بھی حاصل تھا اپنے گھروں کو چھوڑنا نہیں چاہتے تھے۔"[42]

عطیہ سید کے چند افسانے بہت طویل ہیں مثلاً افسانہ "شہرِ ہول"، "دائرہ" اور "طلسمِ دل رُبا" وغیرہ۔ افسانہ "دائرہ" ناولٹ ہے۔ افسانہ "شہرِ ہول" کی طوالت کے بارے میں افتخار جالب لکھتے ہیں۔

"شہرِ ہول کو پھیلایا جاتا تو یہ ایک ناول بن سکتا تھا۔ اپنی موجودہ صورت میں اس میں کئی
واقعات ہیں جو مل کر کہانی کی بنت میں حصّہ لیتے ہیں۔"[43]

جنسی مطالعہ

عطیہ سید نے عورت کے جنس کے مسائل اور نفسیات کو کمال خوبی سے اپنے افسانوں میں جگہ دی۔ انھوں نے اپنے افسانوں میں عورت کو اپنے اصلی روپ میں پیش کیا۔ اسی خوبی کی وجہ سے عطیہ سید کو اُردو فکشن میں ایک خاص مقام حاصل ہے۔ جنسی موضوعات پر انھوں نے اچھی اور معیاری کہانیاں لکھیں۔ وہ عورت کی نفسیات کو اس کی جمالیاتی لچک اور حسّیت کے ساتھ پیش کرتی ہیں وہ مردانہ ظلم اور استحصال کو تنقید کا نشانہ بناتی ہیں۔ افسانہ "کرسمس کی شب" اس کی بہترین مثال ہے۔ جس میں انھوں نے نہ صرف عورت پر کی جانے والی زیادتی پر احتجاج کیا ہے بلکہ سماج کو طنز کا نشانہ بنایا ہے مثال دیکھیے:

"ان کے حلیے عجیب و غریب ہیں۔ آنکھوں سے وحشت برستی ہے۔ چہروں پر ایک
مظلوم شیطنت ہے اور ہنسی میں ایک دیوانگی ہے۔ ان میں سے اکثر کے کپڑے بوسیدہ
اور غلیظ ہیں۔ جوتے پھٹے ہوئے ہیں، ڈیوڑھی کی مدقوق روشنی میں وہ کوئی ٹولہ دکھائی
دیتے ہیں۔ ان کے چہروں کے تاثرات بتا رہے ہیں کہ وہ کسی چیز سے ظالمانہ لطف اٹھا
رہے ہیں۔ وہ چیز جو ان کے درمیان پڑی ہے وہ جس کے تماشے سے وہ ایلکٹھیا لذت
محسوس کر رہے ہیں، روزانا ہے جو نیم برہنگی کی بے بسی کے ساتھ ساتھ مظلومیت کے

غیظ و غضب کی تصویر نظر آتی ہے۔۔۔۔ اس کی آنکھوں میں بے بسی کے آنسو

ہیں۔"[44]

یہ افسانہ امریکن طرزِ زندگی کی ہولناکیوں کی اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔امریکن طرزِ زندگی بھاگ دوڑ کی زندگی ہے یہاں کسی کے پاس انسانیت کے لیے چند لمحے بھی نہیں ہے۔امریکی خود غرض قوم ہے۔افسانہ "پریزاد"میں عطیہ سید کہتی ہیں۔

"۔۔۔۔اس شہر میں ہجوم کی شدت اور جسموں کی قربت کے باوجود کوئی کسی کو نہیں

جانتا۔"[45]

عطیہ سید کی نگاہیں عورت کے نیم عریاں لباس کو چیرتی ہوئی اس کے سیاہ عصیاں جسم کے اندر داخل ہو کر اس کے دل کو ٹٹولتی ہیں اور وہ خود اسی روپ میں ڈھل کر اس کی نفسی کیفیات کو ظاہر کرتی ہیں۔

عطیہ سید اکثر کرداروں کے نام نہیں لیتیں بلکہ ان کا تذکرہ جنس کے حوالے سے کرتی ہیں، مثلاًافسانہ "چھپکلی"میں دونوں کرداروں کا ذکر لڑکا اور لڑکی کہہ کر کرتی ہیں۔"شہرِ ہول"کے آخر میں ایک ماڈل خاتون کا کردار آتا ہے جس کو عطیہ سید نے "فیشن ایبل خاتون"کا نام دیا ہے۔افسانہ "عشقِ تمام(تحیرِ عشق)"میں راوی کے علاوہ ایک نسائی کردار بھی ہے جس کو فربہ اندام امریکن لڑکی کہہ کو مخاطب کیا گیا ہے۔افسانہ "عکس"میں ایک نسائی کردار ہے۔جس کو "عورت"کہا گیا ہے۔

عورت کی نفسیات کے حوالے سے بات کی جائے تو ایسے بہت سے افسانے ہیں جن میں عورت مرکزی حیثیت میں سامنے آتی ہے۔افسانہ "چھپکلی" میں کالے گورے کا مسئلہ سامنے آتا ہے۔اس افسانے میں ایک بدصورت لڑکی کی نفسیات دکھائی گئی ہے، جو حلوائی کے بیٹے کے لیے محبت کے جذبات رکھتی ہے۔ حلوائی کا بیٹا بہت خوبصورت ہے وہ اس لڑکی کو خوبصورت سمجھ کر اس کو اشتیاق بھری نگاہوں سے دیکھتا ہے مگر ایک دن لڑکی جب لڑکے کے سامنے اپنا نقاب الٹ دیتی ہے تو لڑکا اس کی بدصورتی دیکھ کر اس سے منہ موڑ لیتا ہے۔اس افسانے میں چھپکلی کا کردار بہت اہمیت کا حامل ہے۔لڑکی جب اس بدصورت اور غلیظ چھپکلی کو دیکھتی ہے تو اس

چھپکلی میں اس کو اپنا عکس دکھائی دیتا ہے۔ وہ بھی چھپکلی کی طرح بدصورت، تنہا اور اور جامد تھی۔ جسے کوئی دیکھنا پسند نہیں کرتا۔ وہ جب بھی گھر سے باہر نکلتی اپنے آپ کو سر سے پاؤں تک ڈھانپ کر نکلتی تا کہ وہ لوگوں کی نظروں سے بچ سکے۔ لڑکا جب لڑکی کو برقعے میں آتے جاتے دیکھتا ہے تو لڑکی کو اپنے آپ پر اس بدصورت چھپکلی پر بھی پیار آتا۔ مگر لڑکا جب اس کی بدصورتی دیکھ کر اس کو دھتکارتا ہے تو نہ صرف خود سے نفرت ہو جاتی ہے بلکہ اس کی چھپکلی سے بھی حقارت محسوس کرتی ہے۔ اس کا چھپکلی کو مردود اور نابکار کہنا اصل میں اپنی ذات کو کہنا ہے۔ وہ چھپکلی کو مار کر اپنا کتھارسس کرتی ہے۔ یہ کہانی ایک لڑکی کی کہانی نہیں ہے بلکہ ہر اس لڑکی کی کہانی ہے جو چاہے جانے کی خواہش رکھتی ہے۔ مگر لوگ اس کی ظاہری بدصورتی دیکھ کر دھتکار دیتے ہیں۔

اس کہانی سے ایک نقطہ یہ بھی سامنے آتا ہے کہ لڑکی پر جنوں کی کیفیت طاری ہے۔ اسے جب محبت ہوتی ہے تو اس جذب میں اتنی شدت ہوتی ہے کہ اسے چھپکلی جیسی غلیظ مخلوق پر بھی پیار آنے لگتا ہے۔ اور جب نفرت کرتی ہے تو اسی جنوں کی حالت میں وہ اس مخلوق کو بھی مار ڈالتی ہے۔

افسانہ "رقص" میں مصطفائی پر بھی جنون کی کیفیت طاری ہے۔ وہ الجزائریوں سے نسبت ہونے کی وجہ سے تحقیر محسوس کرتی ہے۔ اور فرانسیسی ہونے پر متکبر دکھائی دیتی ہے۔ وہ چاہتی ہے اسے فرانسیسی کہا جائے۔ وہ پسماندہ اور ترقی پذیر ممالک کے لیے حقارت محسوس کرتی ہے۔ وہ آسیہ سے بھی اس لیے نفرت کرتی ہے کہ اوّل تو وہ مصطفائی کو الجزائری کہنے پر مصر تھی جو کہ مصطفائی کو پسند نہیں۔ دوّم یہ کہ آسیہ کا تعلق بھی ترقی پذیر ملک سے ہے۔ اور مصطفائی احساس برتری کے سبب ترقی پذیر ممالک کے کسی باشندے سے کوئی تعلق نہیں رکھنا چاہتی۔

افسانہ "اُڑتا پرندہ اور سنہری مچھلی" میں ارم کی مثال اُڑتے پرندے کی طرح ہے جو آزاد ہے جس پر کسی قسم کی کوئی پابندی نہیں ہے۔ مگر اس کے باوجود وہ زندگی سے خوش نہیں دکھائی دیتی۔ وہ محبت کے سرابوں کے پیچھے بھاگتی رہتی ہے مگر ناکام رہتی ہے۔ وہ اپنی آزادی سے نالاں ہے۔ وہ فروا ملک کو آئیڈیل سمجھتی ہے جس کے پاس گھر شوہر اور بچے ہیں۔ ارم کو فروا ملک پر رشک آتا ہے۔ مگر دوسری طرف فروا ملک کو ارم کی آزادی بھاتی

ہے۔ فرواملک اپنی زندگی اور روزمرہ کے کاموں سے اکتا چکی ہے۔ وہ گھٹن کا شکار ہے۔ اسے اپنے شوہر کی قربت بھی بور کرتی ہے۔ اس کا ایک بچہ بھی ہے جو بہت جلد اپنی آزاد زندگی میں کھو جائے گا۔ فرواملک کے پاس سب کچھ ہوتے ہوئے بھی تنہائی کا شکار ہے۔ ارم فرواملک کو سنہری مچھلی سے تشبیہ دیتی ہے مگر فرواملک کہتی ہے میں آبستان میں بند سنہری مچھلی ہوں۔ میں تمہاری طرح آزادی اور اپنی شخصیت کی تکمیل چاہتی ہوں۔ ایک آزاد پرندے کی طرح جو آزاد کھلی فضاؤں میں مرتا ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ آزاد پرندہ بھی آسودگی کی لہر سے نہیں بچ پاتا۔ اس افسانہ سے یہ نکتہ سامنے آتا ہے کہ ہزار پردوں میں ملنے والی آزادی کبھی حقیقی زندگی کا نعم البدل نہیں ہو سکتی۔

تحیرِ عشق کی فربہ اندام لڑکی کی جنس کی نفسیات کو کمال خوبی سے دکھایا گیا ہے۔ جو جیری نامی لڑکے کے عشق میں گرفتار ہو جاتی ہے۔ جیری نسوانیت کا شکار ہے جو عورت اور مرد کے درمیان کی مخلوق ہے۔ جیری کی شخصیت میں نرگسیت بھی پائی جاتی ہے۔ وہ خود ہی اپنے حسن اور خوبصورتی سے سرشار تھا۔ وہ کسی کو خاطر میں نہیں لاتا۔ وہ فربہ اندام امریکن لڑکی کو مسلسل نظر انداز کرتا ہے اور پروفیسر سے لیکچر کے دوران مختلف سوالوں سے روک ٹوک کر کے اپنی اہمیت جتانا چاہتا ہے۔ لڑکی جیری سے بہت متاثر ہوتی ہے مگر افسانے کے آخر میں جب وہ دیکھتی ہے جیری کسی اور لڑکے کی قربت سے سرشار فٹ پاتھ پر جا رہا ہے تو فربہ اندام لڑکی افسردہ ہو جاتی ہے۔

اس افسانہ کے آغاز میں بھی امریکن لڑکی افسردہ دکھائی دیتی ہے درمیان میں جیری کے آنے سے اس کے چہرے پر خوشی کے آثار نمودار ہوتے ہیں مگر جیری کو نسوانیت دیکھ کر وہ پھر سے پہلے کی طرح افسردہ دکھائی دینے لگتی ہے۔ یوں کہانی کا آغاز اور اختتام بھی لڑکی کی افسردگی پر ہوتا ہے۔ اس افسانہ سے یہ بات واضح بھی ہوتی ہے کہ امریکہ جیسی ریاست میں اس طرح کے واقعات عام ہیں وہاں اس قسم کے تعلق کو معیوب نہیں سمجھا جاتا۔

جنس کے حوالے سے اگر مرد کرداروں کی بات کریں تو بیشتر افسانے مرد کرداروں کے گرد گھومتے ہیں۔ یہ مرد کردار کسی نہ کسی نفسیاتی کشمکش کا شکار دکھائی دیتے ہیں۔ ان میں سے اکثر افسانے رومانوی اور روحانی انداز کے حامل ہیں۔ عطیہ سید کے ہاں رومانی افسانوں کی بڑی تعداد ملتی ہے۔ یہ رومانی افسانے مادی زندگی سے الگ تصوراتی اور تخیلاتی ماحول اور فضا پیش کرتے ہیں۔ جہاں مرد وزن کے دلوں کی دھڑکن، محبت کی فراوانی اور ان گنت تمنائیں ہیں۔ عطیہ سید کے ہاں زندگی کے رومانی پہلوؤں کی جھلک میں جذباتی رشتوں اور حسن و عشق کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ ان افسانوں کے پلاٹ، کردار، مکالمے غرض پورا افسانہ رومان کی چاشنی میں ڈوبا ہوا ہے۔

عشق اور ادب کا گہرا تعلق ہے۔ عشق کی داستان معنی خیز اور کثیر الجہات ہے اور بار بار دہرائی جانے کے باوجود پرانی نہیں ہوتی۔ یہ انسانی جبلت کا حصہ ہے۔ محبت روزِ ازل سے انسان کو ودیعت کر دی گئی ہے یہی وجہ ہے کہ اس موضوع کی اہمیت کم نہیں ہو سکتی اور دیگر اصناف سخن کی طرح اردو افسانے کا موضوع بھی بنی ہے۔ عطیہ سید کے ہاں عشق و محبت کے حوالے سے پیش کیے گئے افسانوں میں عموماً مرد کو بے وفا دکھایا گیا ہے۔ عورت حسن و جمال اور حیا کا پیکر، وفا کی دیوی اور ایثار قربانی میں بے مثل دکھائی گئی ہے۔ اس کے حسن کی دل فریبی اور شباب کی رنگینی قابلِ دید ہے۔ مرد شاطر کھلاڑی ہے جو عورت کے نازک جذبات کو ٹھیس پہنچاتا ہے۔ عورت کی مثالی محبت کی قدر نہیں کرتا۔ عشق و محبت کے حوالے سے لکھے گئے ان افسانوں کا انجام حزنیہ ہے۔ ان افسانوں میں "بنتِ اسرائیل"، "ایبل اور وہ"، "عشقِ تمام"، "برگزیدہ" اور "اُڑتا پرندہ اور سنہرہ مچھلی اہم ہیں۔

حوالہ جات

[1]- عطیہ سید، "خزاں میں کونپل"، ص20

2- عطیہ سید سے انٹرویو، 15 جنوری 2021

[3]- کہانی زندگانی، مشمولہ: دشت، بارش اور رات، ص7

[4]- محولہ بالا، ص:۷

[5]- دشت، بارش اور رات، ص43

[6]-دہلیز، مشمولہ: دشت، بارش اور رات، ص26

[7]- اے بی اشرف، سلمیٰ بینلی، ڈاکٹر۔"عطیہ سید کی کہانیوں کا تجزیاتی مطالعہ "مشمولہ: مجلّہ سپوتنک (ماہنامہ) جلد نمبر16، شمارہ نمبر5۔لاہور: سپوتنک دی مال، 2005ء ص51

[8]- اے بی اشرف، سلمیٰ بینلی، ڈاکٹر۔"عطیہ سید کی کہانیوں کا تجزیاتی مطالعہ "مشمولہ: مجلّہ سپوتنک (ماہنامہ) جلد نمبر16، شمارہ نمبر5۔لاہور: سپوتنک دی مال، 2005ء ص146

[9]- عشقِ تمام، مشمولہ: "خزاں میں کونپل"، ص232،231

[10]-نوحہ مشمولہ: "حکایاتِ جنوں" ص171،170

[11]-سبز اندھیرا مشمولہ: دشت، بارش اور رات، ص42

[12]- سبز اندھیرا، مشمولہ: دشت، بارش اور رات، ص43

[13]- ڈھلوان، مشمولہ: دشت، بارش اور رات، ص10،11

[14]-ہوٹل سلازار، مشمولہ: "خزاں میں کونپل"، ص97

[15]-اُڑتا پرندہ اور سنہری مچھلی، مشمولہ: "حکایاتِ جنوں"، ص34،33

[16]-ڈان کارلوس، مشمولہ: "دشت، بارش اور رات" ص33،32

[17]- محمد خلیل، ڈاکٹر۔ سفر نامہ پاکستان۔ کراچی: بزمِ تخلیق ادب، جنوری 2012ء، ص97

[18]- محمد خلیل، ڈاکٹر۔ سفر نامہ پاکستان۔ کراچی: بزمِ تخلیق ادب، جنوری 2012ء، ص94

[19]-دو چڑیاں مشمولہ: "دشت، بارش اور رات" ص132

[20]- چھپکلی مشمولہ: "حکایاتِ جنوں" ص25

[21]-"اُڑتا پرندہ اور سنہری مچھلی" مشمولہ: "حکایاتِ جنوں" ص31

[22]-"آنسو کا نمک" مشمولہ: "خزاں میں کونپل" ص208

[23]-اے بی اشرف، سلمیٰ بینلی، ڈاکٹر۔ "عطیہ سید کی کہانیوں کا تجزیاتی مطالعہ" مشمولہ: مجلّہ سپوتنک (ماہنامہ) جلد نمبر16، شمارہ نمبر5۔ لاہور: سپوتنک دی مال، 2005ء، ص147

[24]-"شہرِ ہول" مشمولہ: "خزاں میں کونپل" ص63،64

[25]-اے بی اشرف، سلمیٰ بینلی، ڈاکٹر۔ "عطیہ سید کی کہانیوں کا تجزیاتی مطالعہ" مشمولہ: مجلّہ سپوتنک (ماہنامہ) جلد نمبر16، شمارہ نمبر5۔ لاہور: سپوتنک دی مال، 2005ء، ص146

[26]-عطیہ سید، (فلیپ) "دشت، بارش اور رات"، لاہور، دستاویز، جنوری 2013ء

[27]-عطیہ سید، (فلیپ) "غبار"، لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز، 2012ء

[28]-عطیہ سید، (فلیپ) "دشت، بارش اور رات"، لاہور، دستاویز، جنوری 2013ء

[29]-"چھ بجے کی خبر" مشمولہ: "خزاں میں کونپل" ص127،128

[30]-"دو چڑیاں" مشمولہ: "خزاں میں کونپل" ص131،130

[31]-"چھپکلی" مشمولہ: "حکایاتِ جنوں" ص25

[32]-عطیہ سید، (فلیپ) "دشت، بارش اور رات"، لاہور، دستاویز، جنوری 2013ء

[33]-عطیہ سید، (فلیپ) "دشت، بارش اور رات"، لاہور، دستاویز، جنوری 2013ء

[34]-"میری میرا" مشمولہ: "خزاں میں کونپل" ص121

[35]-"برگزیدہ" مشمولہ: "خزاں میں کونپل" ص242

[36]-"شہرِ ہول" مشمولہ: "خزاں میں کونپل" ص61،60

[37]-حامد بیگ، مرزا، ڈاکٹر۔ "نسوانی آوازیں"۔ لاہور، الا کومنیش پٹیالہ گراؤنڈ، س-ن، ص87

[38]-اے بی اشرف، سلمیٰ بینلی، ڈاکٹر۔ "عطیہ سید کی کہانیوں کا تجزیاتی مطالعہ" مشمولہ: مجلّہ سپوتنک (ماہنامہ) جلد نمبر16، شمارہ نمبر5۔ لاہور: سپوتنک دی مال، 2005ء ص142

[39]-"تتلی" مشمولہ: "دشت، بارش اور رات" ص48

[40]-"بلقیان کابت" مشمولہ: "دشت، بارش اور رات" ص18

[41]-"عشقِ تمام" مشمولہ: "دشت، بارش اور رات" ص236

[42]-"شہرِ ہول" "خزاں میں کونپل" ص61

[43]-"پیش لفظ" مشمولہ: "خزاں میں کونپل" ص21"

[44]-"کرسمس کی شب" "خزاں میں کونپل" ص39

[45]-پریزاد، مشمولہ: "خزاں میں کونپل" ص89"

باب سوم

عطیہ سید کی فکشن میں شعور اور لاشعور کی کشمکش

عطیہ سید کی فکشن میں شعور اور لاشعور کی کشمکش

ماہرین کے مطابق روح اور جسم سے انسان کی تخلیق ہوئی مگر روح کو جسم پر برتری حاصل ہے۔ روح کا کام انسانی جسم اور ذہن کو کنٹرول کرنا ہے۔ فرد کا عمل، ردِ عمل اور حرکات و سکنات سب روح کے تابع ہیں اور جب روح جسم کا ساتھ چھوڑ دیتی ہے تو انسانی جسم بے جان ہو جاتا اس میں کوئی حرکت و عمل باقی نہیں رہتی، یوں انسان اپنے ہر عمل کے لیے روح کی تابعداری کرتا ہے۔ قدیم یونانی ماہرین کے مطابق نفسیات کا تعلق ذہن سے ہے۔ کیونکہ علمِ نفسیات کے مطابق انسان کی شخصیت میں پائی جانے والی نفسیات، جذبات و احساسات اور کیفیات کے مجموعے کو Mind کہا جاتا ہے مگر اس کے باوجود نفسیات کو صرف ذہن کے مطالعے کا نام نہیں دیا جا سکتا کیونکہ نفسیات ذہن کے علاوہ ذہن کے اعمال و افعال، ذہنی تربیت اور ذہنی مشاغل وغیرہ کو بھی کنٹرول کرتی ہے۔

سقراط، افلاطون اور ارسطو روح اور ذہن کو ایک دوسرے کے مترادف قرار دیتے ہیں۔ ان کا ماننا ہے کہ نفسیات کا براہ راست تعلق فرد کے دماغ کے ساتھ ہے۔ کیونکہ فرد کے دماغ میں پیدا شدہ خیالات و تصورات اس کی شخصیت اور کردار کی تشکیل ہوتی ہے۔ نفسیات فرد کی کردار اور دماغ کو کنٹرول کرنے کے علاوہ اس کو کمزور اور مضبوط بنانے کا کام بھی کرتے ہیں۔ انسانی فطرت کے مطالعے کو بھی علمِ نفسیات کہا جاتا ہے۔ ماہرین ذہن کے مطالعہ کے بعد انسانی فطرت کو بہت اہمیت دی۔ انسانی فطرت میں احساسات، خوشیاں، غم، وعادات واطوار کے علاوہ تفکر، گفتگو، آرزوئیں، حسرتیں، خواہشات اور رنجشیں وغیرہ کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ المختصر نفسیات فرد کے کردار، ذہن اور انسانی فطرت کا مطالعہ کرتی ہے۔

نفسیات کا مطالعے کے لیے سائنسی طریقہ اختیار کیا جاتا ہے۔ سائنسی طریقہ ہی معیاری طریقہ سمجھا جاتا ہے، علم نفسیات ذہن کے جن تین حصّوں کو بیان کرتی ہے۔ ان کو شعور، لاشعور اور تحت الشعور کا نام دیا گیا ہے۔

1۔ شعوری ذہن

2۔ لاشعوری ذہن

3۔ تحت الشعوری ذہن

1۔ شعوری ذہن

شعور کو انگریزی میں ''Concious'' کہتے ہیں شعور کا مطلب "فوری آگہی" ہے۔ شعور سے مراد ہماری زندگی کے وہ تمام اعمال و افعال ہیں جن سے ہم پوری طرح اور شعوری سطح پر واقف ہوتے ہیں۔ شعور انسانی ذہن کا وہ حصّہ ہے جس تک فرد کو رسائی حاصل ہے اور مواد انسان کے حافظے میں محفوظ ہوتا ہے، شعور کے لغوی معنی جاننے یا علم رکھنے کے ہیں۔ یعنی انسان کب کیا سوچتا ہے، کس طرح محسوس کرتا ہے۔ اور وہ تمام واقعات، خیالات، خواہشات اور اشیاء جن کی بابت انسان علم رکھتا ہے، یہ سب اس کے شعور ذہن کے حصّے ہیں۔ انسان کا شعور وقت اور حالات کی مناسبت سے کام کرتا ہے۔ اس سطح پر ہونے والے کاموں کو دلائل عقلی سے ثابت کیا جا سکتا ہے۔ اس لیے فرد اپنے شعوری عمل کے لیے اس سطح سے رجوع کرتا ہے۔ اس سطح کی تمام کارکردگی، منطقِ فکر کی حامل ہوتی ہے، لہذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ انسانی ذہن کا وہ حصّہ جو خارجی دنیا سے تعلق رکھتا ہے شعور کہلاتا ہے۔

شعور کا تعلق براہ راست انسان کی ذات اور شخصیت سے بھی ہوتا ہے کیونکہ انسان جو کچھ سوچتا ہے ساتھ ہی ان کا حل بھی تلاش کرتا ہے۔ اس کے علاوہ انسان کی زبان سے جو الفاظ ادا ہوتے ہیں وہ سب اس کے شعوری حالات کی مناسبت سے ادا ہوتے ہیں۔ شعوری حالات ہمیشہ ایک سے نہیں رہتے بلکہ ان میں تبدیلی آتی رہتی ہے۔ ہمارے تمام خیالات میں سے ہمارا ذہن صرف ضروری باتوں کو قبول کرتا ہے۔ غیر ضروری باتوں کو بھلانے کی کوشش کرتا ہے۔

2۔ لاشعوری ذہن

لاشعور کو فرائڈ نے واضح کیا۔ فرائڈ کے اس نظریے کے مطابق لاشعور فرد کے نفس کا وہ حصّہ ہے جس کے بارے میں براہِ راست آگہی ممکن ہی نہیں۔ انسان کی خود غرضی، بداخلاقی اور وحشیانہ خواہشات اسی حصّے میں

رہتی ہیں۔ معاشرہ چونکہ اخلاقی قوانین اور نظم وضبط کا پابند ہوتا ہے وہ فرد کے ان روّیوں کو پسند نہیں کرتا۔ فرد کی زندگی میں رونما ہونے والے وہ تمام حالات، حادثات، واقعات اور آرزوئیں جو مکمل نہیں ہو پاتیں ذہن کے پردے کے پیچھے غائب ہو جاتی ہیں۔ اس کو شعور کا نام دیا گیا ہے۔ ان پر کسی بھی انسان کی دسترس حاصل نہیں ہوتی۔ اس میں انسانی زندگی کی وہ تمام اچھی اور بری یادیں پائی جاتی ہیں جن سے انسان ایک وقت میں واقفیت رکھتا تھا۔ مگر اب اس کے شعور سے محو ہو چکی ہیں۔ مگر ضرورت پڑنے پر اور ذہن پر زور ڈالنے سے شعور کی سطح پر آجاتی ہیں۔ ان یادوں میں وہ خیالات وجذبات بھی پائے جاتے ہیں جو انسان کو وراثت میں ملتے ہیں۔

فرائڈ نے لاشعور کو یادوں کا ذخیرہ کہا ہے۔ یہ یادیں شعور سے نکال کر لاشعور میں پھینک دی جاتی ہیں۔ لاشعور ذہن کا سب سے طاقتور حصّہ شمار کیا جاتا ہے اس میں وہ تمام بھولی بسری یادوں نے ڈیرہ ڈال رکھا ہے جو شعور مین بھیس بدل بدل کر آتی ہیں۔ ان کو کوئی نام نہیں دیا جاسکتا۔ ان یادوں کی کوئی ترتیب نہیں ہوتی۔ لاشعور ہو شعور کی ضد بھی کہا جاسکتا ہے۔ لاشعور انسان کے عمل اور کردار پر گہرا اثر ڈالتا ہے۔ لاشعور کو خود غرض حصّہ میں مانا جاتا ہے۔ اس میں انسان کی وہ تمام خواہشات رہتی ہیں جو وہ سماج سے چھپاتا ہے۔ انسان کو معاشرے میں رہنے کے لیے ان خواہشات کو دبانا پڑتا ہے۔

3۔ تحت الشعوری ذہن

شعور اور لاشعور کے بعد تیسری منزل کو تحت الشعور کا نام دیا گیا ہے۔ تحت الشعور روزمرہ کے کاموں اور معاملات تجربات کا نام ہے۔ جس سے انسان آگاہ ہوتا ہے۔ اس حصّے میں انسان کی روزمرہ کی تمام تر معلومات اکھٹی ہوتی رہتی ہے جنھیں ہم غیر اہم سمجھ کر درگزر کر دیتے ہیں مگر ضرورت پڑنے پر شعوری سطح پر لایا جاسکتا ہے۔ تحت الشعور، ذہن انسانی کی تیسری کڑی ہے۔ اس میں ان خواہشات و تجربات اور واقعات کی یادیں پائی جاتی ہیں، جو کبھی شعور کا حصہ تھیں۔ یہ وہ سطح ہے، جہاں ہمارے لاشعوری خیالات شعوری سطح پر ابھر آتے ہیں اور شعور و لاشعور کے درمیان آمدورفت کا ایک مستقل سلسلہ چلتا رہتا ہے۔ اس میں ایک پل کے لیے ذہنی مواس ہمارے شعور میں آتا ہے دوسرے الفاظ میں فرد کے گزشتہ تجربات اور ہیجان کے مسکن کو تحت الشعور کہتے ہیں۔

تحت الشعور بے توجہی کے لمحوں میں فعال رہتا ہے۔ کیونکہ سوچنے کے بعد جب کوئی چیز یاد نہیں آتی، تو یہ واقع کو شعور کی سطح پر اچھال دیتا ہے۔ شاعر یا مصنف اسی قوت کو بروئے کار لا کر تحریریں لگتا ہے اور اپنے تخلیل کے ذریعہ اپنی تخلیقی صلاحیت کو بڑھاتا ہے۔ مختصر یہ کہ شعور اور لاشعور کے درمیانی حصے کو تحت الشعور کہتے ہیں۔

تحلیل نفسی کے اثرات

جدید ترقی یافتہ دور نے انسان کی زندگی کا شیرازہ بکھیر کر رکھ دیا۔ مغربی دنیا کی صنعتی ومادی فتوحات نے فرد کی ذاتی اور سماجی حیثیت کو فراموش کر دیا۔ فرد کی حسیاتی اور جمالیاتی تقاضوں پر کاری ضرب لگی۔ اس صورت حال میں فرد کی داخلی زندگی تہہ بالا ہو گئی۔ جدید دور کا انسان طرح طرح کے نفسیاتی عوارض میں مبتلا ہونے لگا۔ چناچہ اس دور میں انسان اپنی کھوئی ہوئی شخصیت کی بازیافت کی تلاش میں سر گرداں نظر آتا ہے۔ ذہنی انتشار اور کرب کے نتیجے میں فرد کے اندر نفسیاتی الجھنیں پیدا ہوتی ہیں۔ اس زمانے میں فرائڈ نے تحلیلِ نفسی کے عمل کو دریافت کیا۔ تاکہ انسان کی ذہنی بحالی کا راستہ تلاش کیا جاسکے۔

فرائڈ اس انقلاب آفرین شخصیت کا نام ہے، جس نے اپنے فلسفہ سے تمام ماہرِ نفسیات کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ اس نے یہ نظریہ پیش کیا کہ ہسٹریا ایک عضوی بیماری نہیں ہے، بلکہ اس کا تعلق ذہنی عمل سے ہے۔ اس نے مزید کہا کہ انسان کا زندگی میں ہر طرح کی تکلیفوں سے سابقہ پڑتا ہے، جس میں کچھ بھول جاتا ہے اور کچھ یاد رہتی ہیں۔ جو بھول جاتا ہے وہ ذہن کے کسی کونے میں چلی جاتی ہے اور شعور تک نہیں آ پاتی، وہی دبی ہوئی خواہش ہسڑیا کی بیماری کی علامت بن کر سامنے آتی ہیں۔

فرائڈ نے ایک لیکچر کلارک یونیورسٹی میں دیا، جس میں اس نے اس بات کو تسلیم کیا کہ تحلیلِ نفسی کی پیدائش کا موجب وہ خود نہیں، وی یانا (جگہ کا نام) کے ڈاکٹر جوزف بریئور ہیں۔ کیونکہ فرائڈ ابھی طالب علم تھا اور اپنے آخری امتحان کی تیاری میں مصروف تھا۔ اس وقت ڈاکٹر جوزف بریئور نے اس طریقے کو ہسڑیا کی ایک مریضہ پر پہلی بار استعمال کیا اور ایسی تحقیق کی جس میں اس نے بعض ایسی یاداشتوں کے جراحتی آثار کا مشاہدہ کیا

جس کا علم مریضہ کو نہ تھا۔اس کو معلوم ہوا کہ ان یاداشتوں کو شعور میں واپس لانے سے ہسٹریا کے اکثر مظاہرے کا خاتمہ ہو جاتا ہے، یہی تحقیق فرائڈ کے کارناموں کا سنگ بنیاد ہے۔فرائڈ اور برائیو نے مل کر ایک کتاب بھی شائع کی جو دونوں کی متحدہ محنت کا نتیجہ تھی۔

فرائڈ نے جوزف بریئور کی طرح کچھ عرصہ تک ہسٹریا کے علاج کے لئے حالاتِ تنویم کا استعمال کیا، لیکن وہ جلد ہی ہپناٹزم کی خامیوں سے واقف ہو گیا، کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اس کا دائرہ محدود ہے، اس لئے اس طریقہ کو ترک کیا اور علاج کے لئے آزاد ایتلاف کا طریقہ استعمال کیا۔اس میں آزادی سے بولتے ہوئے جب مریض کا ذہن خالی ہو جاتا تو فرائڈ اس کو مزاحمت کا نام دیتا ہے۔اس طریقہ علاج میں معالج اور مریض مل کر مزاحمت کو دور کر کے مزید دبے ہوئے واقعات کا پتا لگاتے ہیں، فرائڈ نے اس تمام کاروائی کو سائیکوانالیسس یعنی تحلیلِ نفسی کا نام دیا ہے۔

تحلیلِ نفس کا باقاعدہ آغاز انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے ابتداء میں فرائد کی "تعبیر خواب کے نظریہ" سے ہوتا ہے، کیونکہ خوابوں کا اصل مقصد تکمیلِ خواہش ہے اور ہمارے خوف وہراس کی تشویسی کیفیت کا اظہار بھی خواب میں ہوتا ہے۔ تحلیلِ نفس کے نظریہ نے پوری دنیا کے ادب پر گہرا اثر ڈالا۔ اصطلاح میں تحلیلِ نفس کا مطلب ذہن میں چھپی ہوئی باتوں کا پتا لگانا ہے، تحلیلِ نفس لاشعور کی گتھیوں کو سلجھا کر ذہن الجھن دور کرتی ہے۔دراصل تحلیلِ نفس انسان کی انفرادی زندگی کے مدفون حالات اور کی تلاش کا نام ہے۔

تحلیل نفسی انسانی کی خارجی باتوں سے گزر کر باطن تک رسائی حاصل کرتی ہے۔اس میں سب سے زیادہ فرد کو اہمیت حاصل ہے، معاشرہ یا ماحول کو نہیں۔یہ انسان کی خواہش ورروایات اور ضبط و نظم کی پیچیدگیوں کو سلجھاتی ہے، جن کا تعلق ذہنی جبریت سے ہے اور یہ جبر انسان میں نفس کی ان لاشعوری قوتوں کے عمل سے پیدا ہوتا ہے جن کی طرف تحلیلِ نفس نے ہماری رہنمائی کی ہے۔اس کے ذریعہ نہ صرف داخلی تحریکات کی جانچ

پڑتال کی جاتی ہے، بلکہ ان لاشعوری خواہشات کو شعور کی سطح پر لا کر شعوری ذات کو ان پر قابو پانے کا موقع فراہم کیا جاتا ہے۔

تحلیلِ نفسی سے مراد انسان کے ذہنی محرکات کا مشاہدہ اس کے اعمال کے مطابق کرنا ہے۔ فرائڈ نظریہ لاشعور کا علاج تحلیلِ نفسی سے کرتا ہے۔ یہ ایک سائنسی طریقہ ہے۔ جس کے علاج کے لیے ایک طویل دورانیہ درکار ہے۔ فرائڈ نے تحلیلِ نفسی کو ایک سائنس دان کی طرح کلینک کی چیز بنا کر عملی زندگی کے ساتھ اس کا رشتہ جوڑ دیا۔ اس عمل میں سب سے پہلے تفتیش زدہ انسان کے لاشعوری محرکات کا پتا لگایا جاتا ہے، اس کے علاوہ انسان کے ان لاشعوری محرکات کو ماضی کی نا قابلِ قبول خواہشات کے ساتھ جوڑنے کے بعد اس کا تجزیہ کر کے حل نکالا جاتا ہے۔ ٹی-ایم-یوسف کے مطابق:

> " تحلیلِ نفسی کا بنیادی اصول یہ ہے کہ لاشعوری خواہشات جو الجھن کا سبب ہوتی ہیں۔ ان کو ابھار کر شعور کی سطح پر لایا جائے اور جو خواہشات شعور کی سطح پر آجائیں ان کی نوعیت کو سمجھا جائے تاکہ معلوم ہو سکے کہ مریض کے اندر کس قسم اور کس شدت الجھاؤ اور مزاحمتیں موجود ہیں۔ "[1]

اردو افسانے میں تحلیلِ نفسی کے اثرات کے حوالے سے "ڈاکٹر حنیف فوق" لکھتے ہیں۔

> " جہاں تک افسانے۔۔۔۔۔ کا تعلق ہے جدید نفسیات کے اثر سے اس میں تحلیلِ نفسی کا رجحان آیا۔ "[2]

عطیہ سید کے افسانوں پر تحلیلِ نفسی کے اثرات کا ثبوت جا بجا دکھائی دیتا ہے۔ انھوں نے بہت سلیقے سے انسان کے ظاہری اعمال، خوف اور وسوسوں کو ان کی ابتدائی زندگی کے حالات و واقعات کی روشنی میں دیکھا ہے۔ مثلاً افسانہ "حکایت خونچکاں" میں لڑکا یکے بعد دیگرے بہت سے بچوں کا قتل کرتا ہے اور قتل کرنے کے بعد انھیں تیزاب کے ڈرموں میں پھینک دیتا ہے۔ اس کے لاشعور میں بچپن میں اپنی ماں کا وہ حقارت آمیز روّیہ ہے کہ جب اس کی ماں اس کی چھوٹی چھوٹی غلطی پر اس کو تہہ خانے میں بند کر دیتی تھی۔ شروع میں وہ اس تہہ خانے

کے اندھیرے سے ڈر اور خوف محسوس کرتا تھا۔ لیکن وقت کے ساتھ ساتھ اس ڈر اور خوف نے اس کے اندر جنون کی کیفیت پیدا کر دی۔ اور اس نے اپنے اندر کے ڈرپوک انسان کو مار کر ایک وحشی اور درندے انسان کو جنم دیا۔ وہ جب بھی کسی معصوم بچے کو دیکھتا تو اس کے لاشعور میں بچپن کی یادیں تازہ ہو جاتی ہیں۔ اور وہ اپنے ماضی میں ہونے والی ناانصافی کا بدلہ معصوم بچوں کو قتل کر کے لیتا ہے۔

افسانہ "دہلیز" میں ڈاکٹر یاسر کے لاشعور میں اپنے باپ کی موت کا وہ منظر ہے جب ڈاکٹر یاسر اور اس کا بیمار باپ گھر میں اکیلے تھے۔ اس دن اس کے باپ کی حالت غیر تھی۔ ڈاکٹر یاسر ابھی کم سن تھا۔ اس نے کبھی کسی کو مرتے نہیں دیکھا تھا۔ وہ اپنے باپ کو تڑپتے دیکھ کر رونے لگا۔ اور روتے روتے اس نے دعا کی کہ یا اللہ میرے باپ کو اس بلا سے نجات دلا دے۔ انھیں اپنے پاس بلا لے۔ ڈاکٹر یاسر کی دعا قبول ہو گئی۔ اس کا باپ مر گیا۔ ڈاکٹر یاسر جب بھی اپنے ہسپتال کے ایک مریض جمیل کے پاس جاتا تو ڈکٹر یاسر کو اس کی آنکھوں سے خوف محسوس ہوتا۔ ڈکٹر یاسر کو یوں محسوس ہوتا۔ جیسے جمیل اس کے ماضی کے واقعے سے آگاہ ہو اور وہ ڈکٹر یاسر کو اپنے باپ کی موت کا زمہ دار سمجھتا ہو۔ لہذا ڈاکٹر یاسر ہر ممکن کوشش کرتا کہ اس کا جمیل سے سامنا نہ ہو۔ عطیہ سید کے افسانوں میں تحلیلِ نفسی کے نمونے جابجا ملتے ہیں، عطیہ سید کے کچھ کردار وطن سے دوری کے سبب ذہنی انتشار کا شکار ہیں افسانہ "واپسی" اور "ہوٹل سلازار" اس کی بہترین مثالیں ہیں۔

"افسانہ "واپسی میں مرد کردار غیر ملک کی خاک چھاننے کے بعد اپنے ملک پاکستان واپس لوٹ آیا ہے۔ اپنے ملک کی مٹی اسے واپس کھینچ لائی ہے۔ یہاں آکر وہ یہاں موجود گلیوں، سڑکوں، بازاروں، سکولوں اور دکانوں کو وہ حسرت بھری نگاہوں سے دیکھتا ہے۔ وہ خوشی محسوس کرتا ہے کہ وہ یہاں اپنے ملک واپس لوٹ آیا ہے۔ وہ سب پرانی چیزوں کو تلاش کرتا ہے مگر کوئی چیز بھی اس کو اپنی جگی پر نہیں ملتی سب کچھ بدل چکا ہے۔ صرف اس کی یادیں زندہ ہیں۔ یہ کردار شعوری طور پر ہر چیز کو دیکھتا ہے اور لاشعوری طور پر ہر چیز کی یادیں اس کے ذہن میں ساتھ ساتھ چلتی رہتی ہیں۔

اسی طرح افسانہ "ہوٹل سلازار" میں بہزاد نوکری کی تلاش میں غیر ملک آتا ہے۔ یہاں آکر اس کو پتا چلتا ہے کہ وہ جتنا پُرسکون ،اطمینان اور آزاد اپنے ملک میں تھا یہاں آکر اتنا ہی پریشان حال ہو گیا ہے۔ تمام مسائل اور وطن سے دوری نے اس کی ناسٹیلجیا میں مبتلا کر دیا تھا۔ایک دن جب وہ ایک خراب لفٹ میں پھنس جاتا ہے تو ایک نشئی اس کے وجود سے چپک جاتا ہے اس وقت اس کے ذہن میں خیال آتا ہے کہ وہ اس غیر ملک میں کیا کر رہا ہے۔ جہاں اس کی کسی کو پروا نہیں ہے۔اس ملک میں اگر وہ مر بھی جائے تو کسی کو خبر تک نہ ہو گی۔اس ملک میں تو اس کے آباؤاجداد کے خون کا ایک قطرہ بھی شامل نہیں ہے یہ ملک اس کے ساتھ کیسے وفا کرے گا۔ وہ فیصلہ کر لیتا ہے کہ وہ اس ملک سے جلد چلا جائے گا اپنے دوستوں، عزیزوں اور رشتہ داروں کے پاس جو اس کی اصل ہے۔

لاشعوری محرکات

ماہرین کے مطابق لاشعور انسان کے ذہن کا وہ حصّہ ہے جس میں انسان کی خود غرضی، حسد، نفرت ،ناجائز خواہشات، حقارت، لالچ اور انسان دشمنی جیسے جذبات واحساسات رہتے ہیں۔انسان ان جذبات کا اظہار وقت اور حالات کے پیشِ نظر کرتا رہتا ہے مگر یہ جذبات معاشرے کے لیے قابلِ قبول نہیں ہوتے۔

ہماری زندگی میں رونما ہونے والے وہ تمام واقعات وحادثات اور آرزوئیں جو مکمل نہیں ہو پاتیں ہیں، ذہن کے پسِ پردہ چلی جاتی ہیں اور جس پر انسان کو دسترس حاصل نہیں ہوتی ہیں،اسے لاشعور کہتے ہیں۔اس میں نہ صرف زندگی کے تمام تجربوں کی یادیں پائی جاتی ہیں، جس سے کبھی ہم واقف تھے، بلکہ وہ خیالات وجذبات بھی پائے جاتے ہیں، جو وراثت میں ملتے ہیں۔انسان عہدِ طفلیت سے لے کر عمر کے آخری مرحلے تک ہزاروں تجربات سے گزرتا ہے اور وہ بے شمار واقعات مثلاً بزرگوں کا لحاظ، خوف اور فطری شرم وغیرہ جن کا اظہار نہیں کر پاتا، وہ لاشعور میں محفوظ ہو جاتی ہیں اور لاکھ توجہ کے باوجود فرد کو اس کا علم نہیں ہوتا۔ فرائڈ نے لاشعور کو یادوں کا ذخیرہ بتاتا ہے، جن کو شعور سے نکال کر لاشعور میں پھینک دیا جاتا ہے۔

لاشعور ذہن کا سب سے طاقتور حصہ ہے۔ اس میں اُن خیالات و خواہشات کی یادیں بھی موجود رہتی ہیں جن کو کوئی نام نہیں دیا جاسکتا۔ یہ بھول ہوئی یادوں کا ذخیرہ ہے، جو شعور میں بھیس بدل کر خواب کے ذریعہ ظاہر ہوتا ہے۔ اس لئے لاشعوری خیالات میں کوئی ربط و تسلسل نہیں ہوتا۔ یہ شعور کی ضد ہے جسے آزاد ایتلاف کے ذریعہ شعور میں لایا جاسکتا ہے یا پھر خواب و خیال کی سطح پر خواہش کی تسکین کا کام کر کے تحریک کی قوت کو گھٹا دیتے ہیں۔ اس لئے فرائڈ خواب کو نیند کا محافظ قرار دیتا ہے۔ لاشعور کے بارے میں ابنِ فرید کا خیال ہے:

"لاشعور اپنے تخلیلات کو من و عن پیش کرنے سے معذور ہوتا ہے کیونکہ ذہنی نظام میں اس پر ایک محاسب بھی مسلط ہوتا ہے جو ہمیشہ ان خواہشات کے اظہار میں مزاحم ہوتا ہے جو خارجی معاشرہ یا ماحول کے لئے عریاں اور کیک ہوتی ہیں لیکن لاشعور ان کے اظہار کے لئے ہر طرح کے چور دروازے تلاش کرتا ہے اور اصل حقیقت کو توڑ مروڑ کر پیش کرتا ہے۔"

لاشعور دبی ہوئی خواہش اور اس کے تمام ملحقہ خیالات کی گتھی کا نام ہے۔ یہ انسان کی فطرت ہے کہ وہ خوشگوار باتیں یاد رکھتا ہے ناخوشگوار باتوں کو ذہن سے بھلانے کی کوشش کرتا ہے جو بعد میں بھیس بدل کر مختلف شکلوں میں اپنا اظہار کرتی ہیں۔ جن خواہشات کو آسودگی میسر نہیں ہوتی وہ لاشعور میں چلی جاتی ہیں اور انسان کے کردار و عمل اور افکار پر گہرا اثر ڈالتی ہیں۔ کبھی کبھی یہ انسانی عمل کا رخ بھی بدل دیتی ہیں۔ لاشعور بہت متحرک اور قوی ہوتا ہے۔ یہ ذہن کا وہ حصہ ہے، جو غیر مہذب اور بے حد خود غرضانہ خیالات سے پر ہوتا ہے۔ انسان کو اپنی خواہشات سماج میں بنائے گئے اصولوں کے مطابق پوری کرنی ہوتی ہیں اور جن باتوں کو سماج حقارت کی نظر سے دیکھتا ہے اسے دبانا پڑتا ہے۔ شارب ردولوی کا خیال ہے:

"لاشعور میں مختلف اور متضاد قسم کی خواہشات ایک ہی وقت میں ایک ساتھ رہتی ہیں۔ وہ ایک اسٹور ہاوس ہے جس میں تمام قابلِ اعتراض اور مخرب اخلاق باتیں جمع رہتی ہیں۔ لیکن ان کا آپس میں کوئی ٹکراؤ نہیں ہوتا بلکہ وہ آپس میں تصفیہ کر لیتی ہیں اور جو خواہش بری ہوتی ہے اس کو محتسب یا سنسر شعور میں آنے سے روک دیتا ہے۔

لاشعور ذہن ایک ایسا حصہ ہے جس میں گندے، فاسد، غیر اخلاقی، بیہودہ اور جنسی حادثات و خیالات جمع رہتے ہیں۔ ان خیالات کی کوشش ہوتی ہے کہ وہ لاشعور کے پردے سے باہر آئیں لیکن سنسر انھیں پیچھے ڈھکیل دیتا ہے۔"

لاشعوری خیالات کا تعلق جبلّت جنس سے بھی ہے، جو انسان کو ہر لمحہ پریشان کرتی ہے۔ اس کی آسودگی کے ضابطے سماج میں متعین ہیں، لیکن اگر اس پر پابندی عائد نہ کی جائے تو بد فعلیاں بڑھ جائے گی، جس سے مغربی ممالک دوچار ہیں۔ ان دبی ہوئی خواہشوں کا ارتقا بھی ہوتا ہے اور اگر ایسا نہ ہو تو یہ خواہش بعض نفسیاتی الجھنوں کی صورت میں ظاہر ہوتی ہیں مثلاً ہسٹریا، نیوا سس، اعصابی کمزوری وغیرہ اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ لاشعور ایک فعال حقیقت ہے جو کسی بھی صورت میں ساکت و جامد نہیں رہ سکتی۔

افسانہ "شمالی ستارہ" میں طبقاتی فرق کو موضوع بنایا گیا ہے۔ مس وارث بظاہر اپنے روّیے سے یہ ظاہر کرتی ہیں کہ وہ طبقاتی فرق کو کچھ نہیں سمجھتی، بلکہ سب کو برابر مقام دیتی ہیں مگر اصل میں ایسا نہیں ہیں۔ وہ شعوری طور پر تو اس بات کو مان رہی ہوتی ہیں مگر لاشعوری طور پر وہ اس بات سے انکاری ہیں۔ بلال جو کہ مس وارث کے کالج میں کلرک ہے، مس وارث کی شخصیت سے بہت متاثر تھا ایک دن جب وہ مس وارث کو ان کی Salary slip دینے ان کے گھر جاتا ہے تو مس وارث اس سے ملنے سے انکار کر دیتی ہیں۔ وہ بلال کی نیت کو شک کی نظر سے دیکھتی ہیں۔ وہ یہ سمجھتی ہیں کہ بلال مس وارث کے قریب ہونے کے لیے ان کے گھر آیا ہے۔ اس افسانے یہ بات واضح ہوتی ہے کی انسان چاہے جتنا بھی کہہ لے کہ اس نے طبقاتی فرق کو ختم کر دیا ہے حقیقتاً وہ اس کو کبھی ختم نہیں کرتا بلکہ یہ فرق ہمیشہ قائم رہتا ہے۔

افسانہ "دو چڑیاں" لڑکیوں پر بے جا پابندیوں پر مشتمل کہانی ہے۔ لڑکیوں کو ان کی مرضی کے مطابق زندگی نہیں گزارنے دی جاتی۔ لڑکیوں کو آزادی حاصل نہیں ہے۔ لڑکیاں بڑی ہو جائیں تو ان کے ماں باپ فوراً ان کی شادی کا سوچنے لگتے ہیں۔ وہ اپنی پہچان بنانا چاہتی ہیں۔ آزاد فضا میں ایک چڑیا کی طرح اُڑنا چاہتی ہیں۔ مگر جیسے وہ اُڑنے کے لیے اپنے پَر کھولتی ہیں ان کے پَر کاٹ دیے جاتے ہیں۔ یا اُن کو شادی کے بندھن میں باندھ کر

قید کر دیا جاتا ہے۔ یہی اس افسانے کا موضوع ہے کہ لڑکیوں کا موقع نہیں دیا جاتا کہ وہ اپنی ذات کا اظہار کر سکیں۔ان کی صیلاحیتوں کو دبایا جاتا ہے، جس سے خطرناک حد تک نتائج بر آمد ہوتے ہیں۔ معاشرے کی بلا ضرورت بندش سے لڑکیوں کے ذہن،ان کی شخصیت اوران کی زندگیوں پر کیا کیااثرات مرتب ہو سکتے ہیں۔ان سب سوالوں کا جواب اس افسانے میں ملتا ہے۔

افسانہ "نوحہ" کا موضوع لڑکیوں کی بے جوڑ اور بڑی عمر کی شادی ہے۔عافیت کی دوست تمکین کی تیس سال کی عمر میں شادی ہوئی اور کچھ عرصہ بعد عافیت کو تمکین کی موت کی خبر ملتی ہے۔ تمکین پر یہ خبر ایٹم بمب کی طرح گرتی ہے۔اسے یقین نہیں آتا کہ تمکین واقعی اس دنیا سے چلی گئی ہے۔عافیت تمکین کے گھر تمکین کو کفن میں لپٹے لاش کے پاس خاموش کھڑی رہتی ہے وہ لوگوں کے نمائشی دکھ اور رونے دھونے اور ہلکی سرگوشیوں کو سنتی ہے۔ تو اسے یہ سب کسی سٹیج ڈرامے کا ناٹک سین دکھائی دیتا ہے۔سب کو تمکین کی اچانک موت کی وجہ جاننے کا تجسس تھا کسی کو اس کی قطعاً پروا نہیں تھی کہ اس کی زندگی شادی کے بعد کیسے گزر رہی تھی۔اس کی مشکلات میں اس کا ساتھ کسی نے نہیں دیا اور اب سب تماشا دیکھنے آ گئے ہیں۔سب چہ مگوئیاں کر رہے تھے کہ تمکین وگ لگاتی تھی اور اس کی بڑی عمر کی شادی تھی اس لیے اس کا یہ انجام ہوا ہے۔کسی نے یہ جاننے کی کوشش نہیں کی کہ کیا تمکین کو اس کے شوہر نے موت کے گھاٹ اتار دیا تھا یا اس نے حالات سے تنگ آ کر خود کشی کی تھی؟سب کو اپنے تجسس کی تشفی چاہیے تھی۔ تمکین کی موت پر نوحہ پڑھنے والا کوئی نہیں تھا۔

جنس اور لاشعور

شعور کے علاوہ انسانی ذہن کا دوسرا اہم حصّہ کا شعور ہے۔ یہ حصّہ شعور سے زیادہ وسیع و عریض ہے۔ یہاں انسان کی ناخوشگوار خواہشات،احساسات اور تجربات رہتے ہیں۔انسان اپنے غم،غصّہ، نفرت،دشمنی،حسد اور جنسی مسائل جیسے جذبات و احساسات اپنے لاشعوری حصّے کی طرف دھکیل دیتا ہے۔ابوالاعجاز حفیظ صدیقی تحریر کرتے ہیں:

"یہ لاشعوری خواہشات اپنی نوعیت کے اعتبار سے حیوانی (بالعموم جنسی) اور اپنے رویّے کے اعتبار سے سخت خود غرض ہوتی ہیں۔ چناچہ وہ ہر وقت اپنی تسکین کے لیے مواقع تلاش کرتی رہتی ہے۔۔۔ وہ شعور کی سطح پر ابھرنا چاہتی ہیں لیکن اخلاقی ضابطوں کا خیال اور معاشرتی اقدار کا حساس انہیں ایسا کرنے سے روکتا ہے اس لیے وہ اپنی تسکین کے لیے کچھ ثانوی ذرائع ڈھونڈ لیتی ہے۔"[3]

ماہرین کے مطابق انسان کی وہ تمام صلاحیتیں اور خواہشات جو وہ سامنے نہیں لاتا اور ان کو دبا کر رکھتا ہے وہ بھی اسی حصّے میں رہتی ہیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ یہ خواہشات ذہنی الجھنوں کا سبب بنتی ہیں۔ یہ لاشعوری خواہشات بھیس بدل بدل کر شعور کی سطح پر آنا چاہتی ہیں، مگر معاشرے کے ڈر اور خوف سے لاشعور میں ہی نمو پاتی رہتی ہیں۔

عطیہ سید نے عورتوں کی نفسیات کو بہت خوب صورتی سے بیان کیا ہے افسانہ "طلسمِ دل رُبا" میں کاروبارِ شوق کو موضوع بنایا گیا ہے۔ اس افسانے میں یہ دکھایا گیا ہے کہ کس طرح امیروں کی پارٹیوں میں عورتیں کسی خوب صورت مرد پر اپنی محبتوں کا جال پھینکتی ہیں۔ خاص طور پر کھاتے پیتے گھرانوں کی عورتوں کے لیے یہ ایک پسندیدہ مشغلہ ہوتا ہے۔ اپنی اداؤں سے مخالف جنس کو اپنی طرف راغب کرنے کے لیے مختلف حربے استعمال کرتی ہیں۔ اس افسانہ میں ہر کوئی مخالف جنس پر فریفتہ دکھائی دیتا ہے۔ مگر کہانی کے آخر میں سب کی محبت ناکام رہتی ہے۔ یہ ایک خوب صورت طلسماتی کہانی ہے۔ کیونکہ اس کہانی میں روانی ہے۔ یہ کہانی داستانوی انداز لیے ہوئے ہے۔ یہ طلسماتی اور داستانوی فضاء دل کو بھاتی ہے۔

"چھپکلی" جنسی موضوع پر لکھا گیا افسانہ ہے۔ اس میں بھی دو مخالف جنس کی نفسیات دکھائی گئی ہے۔ ایک طرف حلوائی کا بیٹا جو حسن پرست دکھایا گیا ہے۔ برقعہ پوش لڑکی کو خوب صورت سمجھ کر اس کی طرف راغب ہوتا ہے مگر لڑکی جب اس کے سامنے اپنا نقاب اتارتی ہے تو وہ اس کے چہرے سے نفرت محسوس کرنے لگتا ہے اور منہ پھیر لیتا ہے۔ دوسری طرف لڑکی جو اپنی دنیا میں مگن تھی۔ اچانک حلوائی کے بیٹے کی کھوجتی

نظروں کو محبت کا اشارہ سمجھ کر اس کی طرف مائل ہو جاتی ہے۔ مگر جلد ہی اپنی بد صورتی کی وجہ سے اس کو اپنی اصلیت کا پتا چل جاتا ہے کہ وہ ایک بد صورت لڑکی ہے جس سے صرف نفرت کی جا سکتی ہے کوئی محبت نہیں کر سکتا۔ جنسی موضوع پر لکھا گیا یہ ایک دلچسپ افسانہ ہے۔

افسانہ "سبز اندھیرہ" بھی عورت کی نفسیات کو بیان کرتا ہے۔ اس افسانے میں بتایا گیا ہے کہ عورت صرف محبت چاہتی ہے۔ اس محبت کو حاصل کرنے کے لیے وہ کسی بھی حد تک جا سکتی ہے۔ عطیہ سید نے اس عورت کی کہانی کے ہر عورت کی کہانی بیان کر دی ہے۔ یہ انفرادی نہیں اجتماعی مسئلہ ہے۔ کہ عورت چاہتی ہے کہ مرد صرف اسی کا ہو کر رہے۔ صرف اسی کی خاطر۔ کہ عورت چاہتی ہے کہ مرد صرف اسی کا ہو کر رہے۔ اور جو ایسا نہیں کرتا۔ اس عورت کے دل میں اس مرد کی محبر باقی نہیں رہتی۔ وہ عورت اس کو اپنی زندگی سے نکال دیتی ہے۔ یہ افسانہ جنس کے موضوع پر بہت اہم اور دلچسپ افسانہ ہے۔ اس افسانہ کا انگریزی میں ترجمہ بھی شائع ہو چکا ہے۔ یہ کردار اصل میں کردار نہیں ہیں۔ کرداروں کی صورت میں میں معاشرہ ہمارے سامنے پیش کیا گیا ہے۔

عطیہ سید مردوں کی نفسیات کی بھی ماہر ہیں۔ وہ کسی بھی کردار کی نفسیات بیان کرتے وقت خود کو اسی کردار میں ڈھال لیتی ہیں۔ یوں ہمیں وہ کردار جیتا جاگتا اور چلتا پھرتا محسوس ہوتا ہے۔ افسانہ "ڈھلوان" میں ایک بوڑھے شخص کی نفسیات بیان کی گئی ہے۔ اس افسانے میں بتایا گیا ہے کہ آواخر عمر میں ایک بوڑھا شخص پر کیا نفسیاتی کیفیت گزرتی ہے۔ کس طرح اس کے ذہن سے چیزیں غائب ہونا شروع ہو جاتی ہیں۔ اور دوسرے لوگ ایسے شخص کی اس کیفیت سے کس طرح تنگ آ جاتے ہیں۔ اور وہ شخص خود کن مشکلات سے گزرتا ہے۔ عطیہ سید نے اس کی کمال خوبی سے بیان کیا ہے۔

جبریت اور خود گریزی کے رجحانات

انسانی زندگی مکمل طور پر جبریت یا عدم جبریت کا مظہر نہیں ہے۔ بلکہ یہ ان دونوں صورتوں کے درمیان کی چیز ہے۔ بعض معاملات میں انسان آزاد ہے مگر بعض صورتوں میں وہ خدا، معاشرہ قوانین اور لوگوں

کے سامنے جواب دہ ہے۔ عطیہ سید بحیثیت فکشن نگار مستحکم انفرادی شناخت کی حامل ادیبہ ہیں۔ وہ جدید اُردو افسانے کی ایک نئی جہت کی تشکیل کنندہ اور افراد کی داخلی کشمکش کی نباض ہیں۔ ان کی تخلیقات اَن دیکھی کثیر الاطراف دنیاؤں میں سفر کرتی دکھائی دیتی ہیں۔ ان کے افسانے سماجی، معاشی اور معاشرتی ہونے کے ساتھ ساتھ نفسیاتی اور فلسفیانہ عناصر کا امتزاج ہیں۔

نفسیات سے گہری دلچسپی اور فلسفہ پسندیدہ مضمون ہونے کے سبب عطیہ سید کے افسانوں پر ان دونوں مضامین کی گہری چھاپ نظر آتی ہے۔ ان کی کہانیاں شعور اور لاشعور کے کسی نہ کسی پہلو کا اظہار کرتی ہیں۔ نفسِ لا شعور بھی ان کہانیوں کا جزولاینفک ہے۔ عامر سہیل لکھتے ہیں:

> "عطیہ سید کی شعریات سے لطف اندوز ہونے کے لیے ضروری ہے کہ ان کا قاری فلسفہ، نفسیات اور دیگر عمرانی علوم سے زیادہ نہیں تو کم از کم مبادیات کی حد تک ضرور واقف ہو، حسن کاری، سحر انگیزی، فکری ارتکاز اور فنی پختگی ان کے افسانوں کے نمایاں اوصاف ہیں۔ ان کے ہاں پلاٹ کی سادگی کے باوجود کہانی پن کا مجموعی تاثر خاصا مضبوط رہتا ہے۔"[4]

رشید امجد رقم طراز ہیں کہ عطیہ سید ان فکشن نگاروں میں سے ہیں جن کا ایک ایک جملہ گہری معنویت رکھتا ہے۔[5] عطیہ سید کے کردار اپنے اعمال و افعال اور گفتگو کے زریعے اپنے لاشعور میں دبے ہوئے خیالات کو غیر محسوس طریقے سے عیاں کر دیتے ہیں۔ خالدہ حسین لکھتی ہیں:

> "عطیہ سید جدید اُردو افسانے کی ایک توانا آواز ہے۔ ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ ۔۔۔۔ تحریر اور شخصیت دونوں کلام کرتی ہوں۔۔۔۔ جب کبھی ایسا ہو گزرتا ہے تو وہ معاصر ۔۔۔۔ کے لیے نوید اور ادیبوں کے لیے خطرے کی گھنٹی ہوتی ہے۔ عطیہ سید صرف لکھتی ہی نہیں، ادب بسر بھی کرتی ہیں۔"[6]

انسان کے شعور کا مضبوط تعلق اس کے لاشعور سے جڑا ہوتا ہے فرد کی زندگی میں پائی جانے والی نفسیاتی الجھنیں دراصل ان تشنہ آرزوؤں کا نتیجہ ہیں جنھیں انسان وقتی طور پر دبا دیتا ہے۔افسانہ "رقص" میں عورت کی نفسیات سمجھنے کے بعد دو متضاد کردار سامنے آتے ہیں۔ اگر ایک طرف مصطفائی کو بد مزاج، ضدی اور ہٹ دھرم بنا کر پیش کیا گیا ہے۔ تو دوسری طرف آسیہ کو خوش اخلاقی، امن اور محبت کی علامت کے طور پر دکھایا گیا ہے۔ عطیہ سید نے مصطفائی کے منفی پہلو کا احاطہ بہت خوب صورتی سے کیا ہے۔ وہ آسیہ کو مختلف طریقوں سے تنگ کرتی ہے کبھی وہ صبح سویرے اس کی نیند خراب کرتی ہے تو کبھی یونیورسٹی میں اس کی مخبری کرتی ہے۔ کبھی کمرے میں اپنے آوارہ دوستوں کو بلا کر شور کرتی ہے تاکہ آسیہ پڑھ نہ سکے۔ غرض وہ آسیہ کے ہر محبت بھری باتوں کا جواب نفرت اور حقارت سے دیتی ہے۔

نفسیاتی سطح پر مصطفائی کا کردار انفرادیت لیے ہوئے ہے۔ کسی بھی شخصیت کا نفسیاتی مطالعہ اس کے مزاج کو مدِ نظر رکھ کر کیا جاتا ہے۔ مزاج کی اصطلاح علمِ نفسیات سے اخذ کی گئی ہے۔ پروفیسر ساجدہ زیدی کے مطابق۔

> "انسانی مزاج اخلاط کی کیفیت کا عکس ہوتا ہے۔ یعنی انسانی جسم میں جو چار اخلاط۔۔۔۔ خون، بلغم، صفرا اور سودا ہوتے ہیں۔ وہ اس کے جسمانی مادی وجود میں بھی ظاہر ہوتے ہیں۔ اور متعلقہ مزاجی کیفیات (کردار اور شخصیت) کے زریعے بھی پہچانے جاتے ہیں۔"[7]

مصطفائی کے لیے صفراوی یا Cholerio مزاج کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے۔ صفراوی مزاج کے لوگ انتہائی غصّہ والے، ضدی، ہٹ دھرم اور تند مزاج ہوتے ہیں۔ وہ مختلف حالات میں شدت سے چیخ و پکار کرتے نظر آتے ہیں۔ اور ہر وقت لڑائی کے لیے کمر بستہ دکھائی دیتے ہیں۔ مصطفائی کا مزاج بھی کچھ ایسا ہی ہے۔اس کے برعکس آسیہ کا کردار بلغمی مزاج کا حامل ہے۔ بلغمی مزاج کے لوگوں میں جو خوبیاں پائی جاتی ہے۔ پروفیسر ساجدہ زیدی لکھتی ہیں۔

"ان میں جوش کی جگہ سکون اور غصّہ و خفگی کی جگہ خوش طبعی اور دوست گری ہوتی ہے۔ اور ایسا آدمی عموماً سب کا دوست ہوتا ہے۔ سماجی اعتبار سے بلغمی مزاج آدمی کافی پسند دیدہ اور ہر دل عزیز ہوتا ہے۔"[8]

آسیہ کا مزاج خوش اخلاقی اور دوستی کی علامت ہے۔ آسیہ کے مزاج کی مثال دیکھیے۔

"اب مصطفائی کھلنے لگی تھی۔ تنک مزاجی میں بھی کمی لگتی تھی۔ آسیہ نے اس گھڑی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے دشمن کے گھر نقب لگانے کی سوچی۔

"دیکھو مصطفائی اب ہمیں ایک دوسرے سے دوستی کر لینی چاہیے۔ آخر ہمیں اس اپارٹمنٹ میں اکھٹے رہنا ہے، تو پھر کیوں نہ مل جل کر زندگی بسر کریں۔"

مصطفائی کچھ سوچنے لگی۔ اس نے غور سے آسیہ کی طرف دیکھا۔ وہ غالباً یہ اندازہ لگانا چاہ رہی تھی کہ اسے صلح کے اس معاہدے میں کوئی نقصان تو نہ ہوگا۔ کچھ تامل کے بعد مصطفائی کہنے لگی۔ "ہاں ۔۔۔۔ یہ تو ٹھیک ہے۔۔۔ بس تمہیں میرے آرام کا خیال رکھنا ہوگا۔"

"جیسا تم چاہتی ہو ویسا ہی ہوگا۔"[9]

شعور، شعور کی رو اور تحت الشعور کا مطالعہ

تحلیلِ نفسی انسانی شخصیت کے عمیق پہلوؤں کو سلجھانے کا نام ہے۔ فرائڈ نے تحلیلِ نفسی کے نظریہ کے تحت ذہن کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے۔

شعور کو انگریزی میں "Concious" کہتے ہیں شعور کا مطلب "فوری آگہی" ہے۔ شعور سے مراد ہماری زندگی کے وہ تمام اعمال و افعال ہیں جن سے ہم پوری طرح اور شعوری سطح پر واقف ہوتے ہیں۔ شعور انسانی ذہن کی وہ سطح ہے، جس تک فرد کو رسائی حاصل ہے اور جس کا مواد انسان کے حافظے میں محفوظ ہوتا ہے، شعور کے لغوی معنی جاننے یا علم رکھنے کے ہیں۔ یعنی انسان کب کیا سوچتا ہے، کس طرح محسوس کرتا ہے اور وہ تمام

واقعات، خیالات، خواہشات اور اشیاء جن کی بابت انسان علم رکھتا ہے، یہ سب اس کے شعوری ذہن کے حصے ہیں۔ انسان کا شعور وقت اور حالات کی مناسبت سے کام کرتا ہے۔ اس سطح پر ہونے والے کارناموں کو دلائلِ عقلی سے ثابت کیا جا سکتا ہے۔ اس لئے فرد اپنے شعوری عمل کے لئے اس سطح سے رجوع کرتا ہے۔ اس سطح کی تمام کارکردگی، معطقِ فکر کی حامل ہوتی ہے، لہذہ ہم کہہ سکتے ہیں یہ ذہن کا وہ حصہ ہے جو خارجی دنیا سے تعلق رکھتا ہے۔

شعور کا تعلق انسان کی ذات یا شخصیت سے بھی ہے کیونکہ انسان اپنے مسائل پر سوچتا ہے، ان کا حل تلاش کرتا ہے اور تمام اشیاء کے بارے میں غور و فکر کر کے ان کا استعمال کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر وقت زبان سے الفاظ کی ادائیگی شعوری حالات کی مناسبت سے ہوتی ہے۔ اس لیے شعوری خیالات ایک حالت پر قائم نہیں رہتے، بلکہ اس میں تبدیلی آتی رہتی ہے کیونکہ ہمارے ہمارے ذہن میں بیک وقت بہت سارے خیالات موجود رہتے ہیں۔ ایک کے بعد دوسرا خیال آتا ہے اور حافظے میں چلا جاتا ہے، لیکن شعور ان میں سے ضرورت کے مطابق باتوں کو قبول کرتا ہے اور بچے ہوئے خیالات کو حافظے میں واپس ڈھکیل دیتا ہے۔ انسان کی شعوری کاوشوں میں عمل ورد عمل گردونواح کے حالات کی مناسبت سے بھی ہوتا ہے۔ اس لیے یہ کہنا درست ہوگا کہ شعور، ذہن کی وہ سطح ہے جس سے ہم پوری طرح واقف ہیں اور اس پر ہمیں دسترس حاصل ہے۔

شعور کی رو کا خالق امریکی ماہرِ نفسیات ولیم جیمس ہے علمِ نفسیات کے جدید تصورات میں شعور کی رو کی اہمیت مسلم ہے انسانی دماغ میں بے ترتیب سوچوں کا تسلسل کے ساتھ ابھرنا ہی شعور کی رو ہے۔ عطیہ سید کی فکشن میں شعور اور شعور کی رو کرداروں کے اعمال و افعال، گفتگو اور حرکات و سکنات پر بلواسطہ یا بلاواسطہ اثر انداز ہوتا ہے۔، مثلاً افسانہ "ڈھلوان" "واپسی" اور " خزاں میں کونپل" وغیرہ۔ ان سوچوں میں کوئی ترتیب نہیں ہوتی، مگر اس کے باوجود یہ سوچیں گزرے لمحات کی یادیں، حال کے احساسات اور مستقبل کی فکر کی صورت میں ہمارے سامنے آتی ہیں۔ مثلاً

> "کیا سامنے کی گھڑی کی ٹک ٹک رک گئی تھی؟ شاید۔۔۔ یا شاید نہیں۔ اُسے عموماً یہ دھوکہ ہوتا تھا۔ پھر اسے گھڑی کی ٹک ٹک سنائی دینے لگتی۔ بعض دفعہ اسے یہ شبہ بھی

ہوتا کہ بازار میں دونوں اطراف کی دکانوں میں خرید و فروخت کی غرض سے آنے والے لوگ اور دکاندار۔۔۔۔ یکدم ساکت ہو گئے ہوں جیسے مووی چلتے چلتے سٹل ہو جائے۔"[10]

سوچیں، فکر اور یادیں کبھی انسان کا پیچھا نہیں چھوڑتی۔ یہ ماضی، حال اور مستقبل بن کر ہمیشہ انسان کے ساتھ رہتی ہیں۔ اسی حوالے سے ابوالاعجاز حفیظ صدیقی تحریر کرتے ہیں:

شعور۔۔۔۔ کسی تعلق کا سہارا لے کر مستقبل سے حال یا ماضی میں اور ماضی سے حال یا مستقبل میں جانکلتا ہے۔۔۔۔۔ کسی واقعے سے ذہن کسی شخص یا مقام کا رخ کرتا ہے اور واقعہ شعور میں آداخل ہوتا ہے۔ اور اس طرح شعور کی رو کے بغیر اور کسی واضح منطقی ربط کی ضرورت کا لحاظ کیے بغیر مدت العمر چلتی رہتی ہے۔"[11]

افسانہ "واپسی" میں مردانہ کردار خود اپنی کہانی بیان کر رہا ہے۔ یہ کردار کافی عرصہ غیر ملک میں رہنے کے بعد اپنے وطن، اپنی زمین، اپنے ماحول میں واپس لوٹ آیا ہے اور یہاں آکر وہ اپنی بھولی بسری یادوں کو پھر سے تازہ کرتا ہے۔ اس کے لاشعور میں ماضی کی یادیں چلتی رہتی ہیں۔ وہ اپنے وطن آکر جن گلیوں، سڑکوں، بازاروں اور عمارتوں کو دیکھتا ہے ان میں سے کوئی چیز اسے اپنی جگہ پر نہیں ملتی۔ وہ ماضی کے کھوئے ہوئے راستوں کا کھوج لگاتا ہے۔ اور گمشدہ جنتوں کی تلاش کا عمل جاری رکھتا ہے مگر بے سود۔

شعور اور لاشعور کے علاوہ انسانی ذہن کے تیسرے حصّے کو تحت الشعور کا نام دیا گیا ہے۔ اصل میں تحت الشعور انسانی نفس کا وہ حصّہ ہے جس میں انسان کے روزمرہ کے تمام معاملات و تجربات جمع ہوتے رہتے ہیں جو انسان کے شعور و آگاہی سے ہٹ کر اس کے تحت الشعور میں نمو پاتے رہتے ہیں۔ جو یاد کرنے سے فوری طور پر ذہن میں نہیں آتے مگر تھوڑی سی کوشش سے وہ شعور و آگہی میں آجاتے ہیں۔ عطیہ سید کی فکشن میں شعور اور لاشعور کی کشمکش اس بات کی عکاسی کرتی ہے کہ وہ ایک اعلیٰ پایہ کی تخلیق کار ہیں۔ ان کے افسانے پڑھ کر ان پر

جمودی کیفیت طاری نہیں ہوتی بلکہ ایک بہتے ہوئے دریا کی روانی محسوس ہوتی ہے جس کا پانی جتنا خاموش ہوتا ہے اتنی ہی اپنے اندر گہرائی لیے ہوئے ہوتا ہے۔

عطیہ سید کی تاریخ سے دلچسپی اور مختلف ممالک اور قوموں کا حالات و واقعات کا کھوج لگانے کی عادت کو نفسیاتی سطح پر Exploration motive کا نام دیا گیا ہے۔ امریکہ جیسی ترقی یافتہ قوم کی نظر میں حبشی سیاہ فام کم تر درجے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ وہاں ان کو امریکیوں جیسے حقوق حاصل نہیں ہیں اور غلامی کرنے پر مجبور ہیں۔ عطیہ سید نے کالے گورے کے مسائل کو فنی مہارت سے پیش کیا۔ اس حوالے سے ڈاکٹر سلیم اختر ان الفاظ میں اظہار کرتے ہیں:

> ''وہ امریکہ کی بلند عمارات، تیکنیکل ترقی اور جدید مشینوں سے مرغوب نہ ہوئی بلکہ اس نے امریکی معاشرے کے داخلی تضادات، فرد کی تنہائی، مجلسی زندگی میں ابرتی اور زندگی کو پُر معنی بنانے والے رشتوں کی ٹوٹ پھوٹ کا فلسفی جیسی گہری بصیرت سے مطالعہ کر کے اپنے افسانوں کا موضوع بنایا۔''[12]

عطیہ سید کو نفسیات اور فلسفہ سے اس درجہ دلچسپی ہے کہ انھوں نے اپنی فلسفیانہ کتب اور مضامین کے علاوہ اپنے افسانوں میں بھی انھیں برتا ہے۔ یوں ان کے افسانے فلسفیانہ خیالات کے ساتھ ساتھ، داخلی کشمکش اور نفسیاتی الجھنوں کی بھی بھرپور عکاسی کرتے ہیں۔ عطیہ سید نے شعور اور لاشعور کے زریعے انسانی نفسیات کو اجاگر کیا ہے۔ انھوں نے انسان کے نفس کے ان حقائق کو بیان کیا ہے۔ جہاں عام انسان کی نظر نہیں پہنچتی۔

''سبز اندھیرا'' میں عورت کا کردار متضاد شخصیت کا حامل ہے۔ وہ متضاد جذبات رکھتی ہے۔ نفسیات کی سطح پر اسے جذبیت(Ambivalence) کہتے ہیں۔ اس طرح یہ عورت نمائشیت (Exhibitionism) کا شکار بھی ہے۔ یہ ایک نفساتی پہلو ہے۔ وہ چاہتی ہے کہ جو میرا ہے میرا ہی رہے۔ یہ کہانی ایک عورت کی کہانی نہیں ہے۔ ہر عورت کی کہانی ہے۔ اس لیے عطیہ سید نے اس کردار کو کوئی نام نہیں

دیا۔ بلکہ اس کو "وہ" کہہ کر مخاطب کیا ہے ہر عورت چاہے جانے کی خواہش رکھتی ہے۔ وہ اپنے چاہنے والوں کو اپنی ذات میں محو دیکھنا چاہتی ہے۔ پروفیسر ساجدہ زیدی نمائشیت کی وضاحت اس طرح کرتی ہیں۔

"نمائشیت کے تحت انسان خود کو دوسروں کی نظروں کا مرکز بنا کر خوش ہوتا ہے۔ خود نمائی کے اس عمل میں اسے جو لذت ملتی ہے وہ انفعالی لذت ہے"[13]

وہ کہانی نگار کے آگے اپنا آپ کھول کے رکھ دیتی ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ عورت ہر صورت اپنی ذات کو اہمیت دینے کی خواہش مند ہوتی ہے چاہے وہ زبان سے ہو یا عمل سے۔

افسانہ " کے کردار مختلف نفسیاتی مسائل کا شکار ہیں۔ عطیہ سید کے افسانے "دہلیز" میں ڈاکٹر یاسر کا کردار بچپن میں اپنے باپ کی اپنی آنکھوں دیکھی موت کی وجہ سے نفسیاتی الجھن کا شکار ہے۔ عطیہ سید نے کردار ڈاکٹر یاسر کی نفسیاتی الجھن کو تلاش کر کے اس کے نفسیاتی مسائل کو تحلیل نفسی سے حل کیا ہے۔

افسانہ "حکایتِ خونچکاں" میں لڑکا اوڈی پس کا شکار ہے۔ وہ بچپن میں اپنے باپ سے زیادہ ماں کے لیے محبت کے جذبات رکھتا تھا۔ اور ماں اس سے اتنی ہی لاتعلقی اور بے رخی سے پیش آتی تھی۔ اس کے برعکس لڑکا باپ سے نفرت کرتا تھا لیکن اس کا باپ اتنی ہی شدت سے اس سے اپنا پیار ظاہر کرتا تھا۔ لڑکا اپنی ماں سے بچپن سے بہت محبت کرتا ہے۔ مگر اس کی ماں اپنی بیٹی سے پیار کرتی ہے اور اس لڑکے سے بے رخی اور بے اعتنائی سے پیش آتی ہے۔ اور ہر چھوٹی غلطی پر اس تہہ خانے میں بند کر دیتی ہے۔ لڑکے کو آہستہ آہستہ اپنی ماں سے نفرت ہونے لگتی ہے۔ یوں لڑکا ماں سے محبت اور نفرت کا شکار ہو جاتا ہے۔ نفسیاتی سطح پر اس کیفیت کو(Embalence) کہا جاتا ہے۔ یوں ماضی کے تمام واقعات اس کے لاشعور کا حصّہ بن جاتے ہیں۔ لڑکے کے شعور میں یہ خوف ہمیشہ رہا۔ لڑکے کا یہی ڈر اور خوف جرم میں بدل گیا۔ کردار "میری" ہسٹریا کا شکار ہے۔ اس کو وقفے وقفے سے ہسٹریا کے دورے پڑتے ہیں۔ اسی دوران اس کا ذہن ماضی میں پیش آنے والے واقعات کی طرف مڑ جاتا ہے۔ افسانہ "دائرہ" میں بھی راوی فریدے کو ذہن سے نکالنا چاہتا ہے۔ مگر وہ لاشعوری طور پر

فریدے کے بارے میں ہی سوچتا رہتا ہے وہ شدید کرب اور اذیت کا سامنا کرتا ہے۔اس حالت میں عطیہ سید ایک ماہرِ نفسیات کی طرح مریض کی لاشعوری سوچوں اور خواہشوں کو سامنے لاتی ہیں۔

اپنے کئی افسانوں میں عطیہ سید نے شعور کی رو کا استعمال کیا ہے۔جس کا ہم انگریزی زبان میں(Stream of consciousness) کہا جاتا ہے۔شعور کی رو میں لکھے گئے ان افسانوں میں عطیہ سید کی نظر کرداروں کے نفس پر ہوتی ہے۔ ساتھ ہی قاری بھی کرداروں کا نفسی مطالعہ کرتا ہے۔افسانہ "واپسی "شعور کی رو میں لکھا گیا افسانہ ہے۔اس افسانے میں شعور کی رو کو اس طرح نبھایا گیا ہے کی کرداروں کے ذہن میں آنے والے خیالات و تصورات کو افسانے میں ترتیب سے بیان کیا گیا ہے۔ان کے سوچنے کا انداز جذباتی عناصر کی ترجمانی کرتا ہے۔افسانے کے کردار کا ایک عظیم ماضی ہے جس کی یادیں اس کے لاشعور میں مسلسل چلتی دکھائی دیتی ہیں۔اس کے ساتھ ہی وہ اپنے آنے والے کل کے بارے میں خوفزدہ بھی ہے

"وقت کم ہے۔۔۔اور تیزی سے گزر رہا ہے۔۔۔دل ڈوبتا جا رہا ہے۔۔۔ نبض سست ہوتی چلی جا رہی ہے۔۔۔ نظر دھندلانے لگی ہے، حتیٰ کہ کاغذ پر لفظوں کے بجائے شکستہ تحریریں۔۔۔۔ ٹیڑھی میڑھی لکیریں اُبھرنے لگی ہیں۔

مجھے اپنی ماں دکھائی دیتی ہے۔ وہ بہت جلدی میں ہے۔کپڑے والی الماری میں کچھ تلاش کر رہی ہے۔ میں دھیرے سے پکارتا ہوں،"ماں! اس نے شاید سنا ہی نہیں۔ وہ میری طرف پیٹھ کیے کپڑوں میں کچھ تلاش کرتی رہی۔۔۔اور پھر جس طرح اچانک نمودار ہوئی تھی اسی طرح سے غائب ہو جاتی ہے۔۔۔یکدم۔۔۔بغیر کچھ کہے سنے۔۔۔ بغیر کسی حرفِ تسلی کے۔"[14]

اس افسانے میں ماضی، حال اور مستقبل ایک لڑی میں پروئے دکھائی دیتے ہیں۔ یہ کردار ماضی کی تہذیب، آبادی، روایات اور رشتوں کو تلاش کرتا دکھائی دیتا ہے۔

"مارکیٹ کے الٹے ہاتھ چوک پر ایک پان فروش تھا۔۔۔۔ کھوکھے کے ساتھ فوٹو گرافر کی دکان بھی موجود ہے۔۔۔ چلو پان والا تو موجود ہے اپنی جگہ۔۔۔۔ اور وہ لو اس فوٹو گرافر کی جھلک بھی دکھائی دے رہی ہے دروازے میں۔۔۔۔ کوئی تو ہے بچھڑے زمانوں کا۔

وہ دونوں کہاں ہیں؟ کیا بوڑھا مان والا مر گیا ہے؟ عین ممکن ہے۔۔۔اور بیٹا؟ ہو سکتا ہے کہ وہ اتنے برسوں میں کہیں اور منتقل ہو گیا ہو؟ لیکن پل دو پل پہلے تو وہ یہیں تھے۔۔۔۔ مجھے دکھائی دیے تھے، اسی لیے تو میں دوڑتا ہوا اسی جگہ تک پہنچا تھا۔"[15]

عطیہ سید کے افسانے کا آغاز خوبصورت مناظر سے ہوتا ہے۔ یعنی وہ اصل کہانی سے پہلے قاری کو اس فضا اور ماحول سے متعارف کرواتی ہیں، جہاں کوئی واقعہ رونما ہونے والا ہو۔ یوں قاری کہانی میں ہونے والے واقعات کے ماحول سے پہلے ہی آگاہ ہو جاتا ہے۔

"پھیلتی ہوئی روشنی، درختوں میں چڑیوں کا شور اور ہسپتال کے صحن اور کمروں میں گل ہوتی ہوئی بتیاں، بتا رہی تھیں کہ رات ڈھل چکی تھی۔ سپیدہ سحر نے خوابیدہ ہسپتال کو بیدار کر دیا تھا۔"[16]

ایک اور مثال دیکھیے۔

"چیڑ کے جنگل میں سرمست ہوا چل رہی تھی۔ سارا جنگل وجد میں تھا۔ مسلسل بارشوں سے زمین نم ہو کر نسواری ہو چکی تھی۔ درختوں کے تنوں کی چھال نکھری ہوئی تھی۔ فضا میں چیڑ کی خوشبو اور زمین پر اس کے پتوں کی سوئیاں بکھری ہوئی تھیں۔ ہم نے سرور سے آنکھیں بند کیں اور لمبے لمبے سانس لینے لگے کہ پاکیزہ معطر ہوا کی زیادہ سے زیادہ مقدار کو پھیپھڑوں میں ذخیرہ کر لیں۔"[17]

کچھ کہانیاں واحد متکلم میں لکھی گئی ہیں اور کچھ خود ہی روانی کے ساتھ آگے بڑھتی جاتی ہیں۔ اس صورت میں پتا چلتا رہتا ہے کہ کرداروں کے ذہنوں میں کیا چل رہا ہے۔

عطیہ سید کی کہانیوں میں ایک باقاعدہ ترتیب پائی جاتی ہے۔اسی ترتیب سے قاری کے ذہن میں وقت، مقام، کردار اور واقعہ سے متعلق جذباتی تعلق استوار ہوتا ہے۔عطیہ سید کی کہانیوں میں جذباتی مناظر بھی پائے جاتے ہیں جو کرداروں کی جذباتی کیفیت کے آئینہ دار ہیں۔ عطیہ سید کی کہانی کے کرداروں کو جانچنااور سمجھنا بہت ضروری ہوتا ہے کیونکہ ان کی کہانی میں کردار کے ماتھے کی ایک شکن، آنکھوں کی جنبش اور چہرے کی رنگت کا بدلناوغیرہ اندرونی کیفیات کو ظاہر کرتا ہے۔

عطیہ سید کے افسانے امریکی معاشرے کے عکاس ہیں۔ جہاں انسان کے دکھ، درد، اذیت اور تنہائی کا احساس جابجا دکھائی دیتا ہے۔اس کے علاوہ ان کی کہانیوں میں اداسی، خود پسندی اور دکھ کی ابدیت جیسے عناصر بھی بکثرت پائے جاتے ہیں۔ان کے ہاں انسانی زندگی کا المیہ پیش کیا گیا ہے۔عطیہ سید کی کہانی کا انسان عجیب نفسیاتی کشمکش کا شکار ہے۔ تمام تر آسائشیں ہونے کے باوجود تنہائی اس کا مقدر ہے۔ وہاں لوگوں کا ہجوم دکھائی دیتا ہے۔ مگر سب انسانوں کی شکل میں روبوٹ ہیں۔۔ جو بے حس ہو چکے ہیں۔ وہاں کسی کے پاس اتنا وقت بھی نہیں کہ وہ دوسروں کے دکھ درد میں شریک ہو سکیں۔اسی سبب ان کے افسانوں میں زندگی کی بے ثباتی کا تسلسل اُبھر کر سامنے آیا ہے۔

عطیہ سید نے امریکہ جیسی نام ونہاد ترقی یافتہ مغربی زندگی کی ایک الگ جھلک دکھا کر سب سے الگ اچھوتا انداز اپنایا ہے۔امریکی زندگی کا یہ الگ رنگ اکثریت کے لیے ایک نیا انکشاف ہے۔ عطیہ سید کہانی بتانے کا ہنر جانتی ہیں۔ وہ ایک خاص انداز سے کہانی کا آغاز کرتی ہیں۔ کمال فنکاری سے کرداروں کو سامنے لاتی ہیں اور کہانی کو نکتہ ءعروج تک پہنچانے کے بعد فنی مہارت سے اس کا اختتام کرتی ہیں۔ کہانی کے پلاٹ کو منظم اور بہتر انداز میں قاری کے سامنے لاتی ہیں۔افتخار جالب لکھتے ہیں:

> "کہانی بتانے کی یہ تکنیک دوستوئیفسکی نے وسیع پیمانے پر اپنے ناولوں میں استعمال کی ہے۔ عطیہ سید نے اپنی ہنر مندی سے اس تکنیک کا منی ایچر اپنے کئی افسانوں کے درو بست میں سمیٹا ہے۔"[18]

ان کی کہانیوں میں کرداروں کی فہرست زیادہ طویل نہیں ہوتی۔ان کے افسانوں میں صرف چند کردار ملتے ہیں۔ وہ ان چند کرداروں کے ذریعے پوری کہانی بیان کرنے کا ہنر جانتی ہیں۔ کرداروں کی کمی کہانی کو بوریت کا شکار نہیں ہونے دیتی بلکہ قاری کی دلچسپی برقرار رہتی ہے۔ عطیہ سید کے افسانوں میں کردار انسان نہیں ہوتے بلکہ انسانوں کے اندر وہ معاشرہ چھپا دکھائی دیتا ہے جو ایسے انسانوں کو بنانے کا موجب بنتا ہے۔ان کے افسانوں میں معاشرہ مرکزی کردار ہے۔ جو انسانوں کی اپنی پیداوار ہے۔ کالے گورے کا مسئلہ عطیہ سید کے افسانوں میں بکثرت پایا جاتا ہے۔ کالا رنگ اور بدصورتی کیوں ہمارے معاشرے میں بری سمجھی جاتی ہے؟ کیا کسی کی ظاہری بدصورتی سے اس کے دل کا حال جان لیا جاتا ہے؟ کیا ایک بدصورت انسان کے جذبات واحساسات نہیں ہوتے؟ کیا بدصورت انسان، انسان نہیں ہوتا؟۔ عطیہ سید نے اپنے افسانوں میں ان تمام سوالات کا جواب تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔

مرد کے مقابلے میں عورت اکثر افسانوں میں مرکزی کردار کے روپ میں سامنے آتی ہے۔ غربت اور افلاس عطیہ سید کے افسانوں کے خاص موضوعات ہیں۔ان کے اکثر کردار غربت میں دھنسے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔اور کچھ زندگی کی دوسری محرومیوں کے سبب ذہنی کشمکش کا شکار ہیں۔ ہر افسانے کا ہر کردار معاشرے کے کسی نہ کسی مسائل کی عکاسی کرتا دکھائی دیتا ہے۔ان کے افسانوں میں انسان کی بے بسی، مجبوری، تنہائی اور اداسی کو موضوع بنایا گیا ہے۔ یہ تمام کردار ہمارے معاشرے کے کردار معلوم ہوتے ہیں۔ان کہانیوں کے واقعات ہمارے ماحول سے جڑے ہیں۔ تنہائی عطیہ سید کا خاص موضوع رہا ہے۔ تنہائی کے حوالے سے پروفیسر عاصم صحرائی لکھتے ہیں:

> "جو لوگ تنہائی کاٹتے ہیں وہ اپنی اس تنہائی کو بیان کرتے وقت کتنا ہی محتاط انداز کیوں نہ اختیار کریں یہ بات پر شبہ سے بالا ہے کہ انھیں اس ذہنی علامت کا سامنا کرتا پڑتا ہے۔"[19]

عطیہ سید نے مختلف ممالک اور معاشروں کی کہانیاں لکھ کر ادب میں ایک نیا تجربہ کیا ہے۔ یہ اُردو ادب میں پہلی بار ہوا ہے کہ کسی ادیب نے بہ یک وقت مختلف ممالک کے منظر ناموں کو اپنی کہانیوں میں برتا۔ ان کے منظر ناموں سے تنوع اور سکون کا احساس اُبھرتا ہے۔

" عطیہ سیّد پاکستانی ریتل کے ساتھ ساتھ یورپین ، روسی ، ایرانی، جرمن اور کئی دوسرے ممالک کے منظر ناموں کی خوبصورتی سے آگاہ ہیں اور انہیں نمایاں کرنے کے فن سے بھی "[20]

عطیہ سید نے اپنی کہانیوں میں انسانی زندگی کو المیہ بنا کر پیش کیا ہے۔ وہ المیہ کو معاشی، معاشرتی اور نفسیاتی سطح پر پیش کرتی ہیں۔ "شہر ہول" میں انسانی زندگی کا المیہ دکھائی دیتا ہے۔ مثلاً ڈی ڈی کولٹ کا المیہ یہ ہے کہ وہ پُر آسائش عمارت میں رہتا ہے۔ اس نے پانچ شادیاں کر رکھی ہیں۔ اس کے دو بچے بھی ہیں، اس کے باوجود وہ تنہائی کا شکار ہے۔ اس نے عمارت کی اوپری منزل میں خود کو ایک کمرے میں بند کر رکھا ہے۔ وہ لوگوں سے اپنا تعلق ترک کر کے اسی اکیلے کمرے میں ساری زندگی گزار دیتا ہے۔ اور اسی حالت میں ایک دن مر جاتا ہے۔ مرتے وقت اس پر کیا گزرتی ہے یہ کوئی نہیں جانتا۔ اسی طرح اسی افسانے کا ایک کردار مسز فان کریمر کی زندگی کا المیہ یہ ہے کہ وہ انتہائی غریب ہے۔ اس کے پاس رہنے کے لیے گھر نہیں ہے۔ اس کی غربت اس کو گتے کے ڈبے میں رہنے پر مجبور کرتی ہے۔ اسی طرح عطیہ سید کے ہر افسانے میں کوئی نہ کوئی المیہ ضرور ملتا ہے۔ جس کو انھوں نے نہایت خوب صورت انداز میں بیان کیا ہے۔ اس حوالے سے ڈاکٹر اے بی اشرف کہتے ہیں:

"زبان کو مہارت کے ساتھ استعمال کرتی ہیں۔ کہانی میں جملے دلکشی اور لطافت سے بھرپور ہوتے ہیں۔ مختصر کہانی میں لفظ اور جملے کی بڑی اہمیت ہوتی ہے عطیہ اِس اہمیت سے واقف ہیں"۔[21]

عطیہ سید کے افسانوں کی ایک خاص بات یہ ہے کہ ایک ہی کردار ساری کہانی کو بیان کرتا چلا جاتا ہے۔ یہی کردار کہانی میں موجود ثانوی کرداروں کا تعارف بھی کرواتا ہے۔ ان کے افسانوں میں کردار اتنی خوب صورتی

سے آتے ہیں کہ کہانی کا حسن برقرار رہتا ہے۔ عطیہ سید کا اندازِ تحریر فلسفیانہ ہونے کے ساتھ ساتھ شاعرانہ بھی ہے۔

"عطیہ سید کی کہانیوں میں آدھا فلسفی اور آدھا شاعر چھپا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی کہانیوں میں حقیقت اور رومان اور جذبہء فکر کا خوب صورت امتزاج ملتا ہے۔"[22]

عطیہ سید عقلی اندازِ فکر کی حامل افسانہ نگار ہیں۔ وہ مشاہدات کو عقلی تناظر میں دیکھ کر اس کی فلسفیانہ توجیح پیش کرتی ہیں۔ عطیہ سید کہانی کو بیان کرتے ہوئے جذباتی انداز کے قریب پہنچ جاتی ہیں۔ ایسی صورت میں وہ ایک رومانوی انداز اختیار کر لیتی ہیں:

""""عطیہ سید کا زاویہ نگاہ شاعرانہ بھی ہے اور فلسفیانہ بھی۔ فلسفی چیزوں کو عقلی انداز میں سوچتا اور منطقی رائے قائم کرتا ہے۔ جبکہ شاعر چیزوں کو جذباتی لگاؤ سے دیکھتا اور رومانوی انداز میں پیش کرتا ہے۔"[23]

عطیہ سید نے اپنے افسانوں میں انسانی روّیوں کو بہت خوب صورت انداز سے پیش کیا ہے۔ خاص طور پر امریکی زندگی اور ان کے مسائل کو فنکاری اور چابک دستی سے افسانوں میں جگہ دی ہے۔

المختصر ہم کہہ سکتے ہیں کہ عطیہ سید کے کرداروں میں شعور اور لاشعور کی کشمکش حقیقی زندگی کے قریب معلوم ہوتی ہے۔ ان کرداروں کی نفسیاتی الجھنیں، ان الجھنوں کا پس منظر اور ان کا تحلیلِ نفسی کے زریعے حل عطیہ سید کو ایک منفرد افسانہ نگار بنا دیتا ہے۔

حوالہ جات

---

[1]-ٹی۔ایم۔یوسف،"جدید نفسیات"،علمی کتب خانہ اُردو بازار لاہور،2003ء،ص347

[2]-ڈاکٹر حنیف فوق،مثبت قدریں،دبستانِ مشرق،ڈھاکہ 1968ء،ص72)

[3]-ابوالاعجاز صدیقی،"کشاف تنقیدی اصطلاحات"،مقتدرہ قومی زبان اسلام اباد،1985،ص155

[4]-عطیہ سید،(فلیپ)"دشت،بارش اور رات"دستاویز،لاہور۔جنوری2013ء

[5]-عطیہ سید،(فلیپ)"دشت،بارش اور رات"دستاویز،لاہور۔جنوری2013ء

[6]-خالدہ حسین،متکلم افسانے،مشمولہ:ماہنامی الحمرا،لاہور،اگست2014ء،ص42

[7]-پروفیسر ساجدہ زیدی،انسانی شخصیت کے اسرار ورموز،یو پبلشر ز اُردو بازار لاہور،2004ء،ص47

[8]-پروفیسر ساجدہ زیدی،انسانی شخصیت کے اسرار ورموز،یو پبلشر ز اُردو بازار لاہور،2004ء،ص47

[9]-"رقص"مشمولہ:"حکایاتِ جنوں"ص16،17

[10]-"دشت،بارش اور رات"،ص9

[11]-ابوالاعجاز صدیقی،"کشاف تنقیدی اصطلاحات"،مقتدرہ قومی زبان اسلام اباد،1985،ص110

[12]- سلیم اختر،ڈاکٹر،"عطیہ سید"مشمولہ: "صنفِ نازک کی کہانیاں"(مرتب)طاہر تونسوی،لاہور،الحمد پبلی کیشنز،1996ء،367)

[13]- پروفیسر ساجدہ زیدی،'انسانی شخصیت کے اسرار و رموز،یو پبلیشرز ،اُردو بازار لاہور، 2004ء،ص289

[14]-"واپسی"مشمولہ:"دشت،بارش اور رات"ص111،110

[15]-ایضا

[16]-"دہلیز"مشمولہ:"دشت،بارش اور رات"ص21

[17]-"جلوہ" مشمولہ: "حکایاتِ جنوں" ص41

[18]-"خزاں میں کونپل" ص21

[19]- بحوالہ عاصم صحرائی، پروفیسر۔ جے سی للّی۔ "بنیادی نفسیات" اے ایل پبلشرز، ایڈیشن اوّل، 1993ء، ص87)

[20]-عطیہ سید، (فلیپ) "دریا کنارے" لاہور، دستاویز، جنوری، 2014

[21]-اے بی اشرف، سلمٰی بینلی، ڈاکٹر۔ "عطیہ سید کی کہانیوں کا تجزیاتی مطالعہ" مشمولہ: مجلّہ سپوتنک (ماہنامہ) جلد نمبر 16، شمارہ نمبر 5۔ لاہور: سپوتنک دی مال، 2005ء ص146

[22]-ایضا، ص: 141

[23]-ایضا

باب چہارم

عطیہ سید کے ناول غبار میں نفسیاتی اور فلسفیانہ عناصر کا تجزیہ

عطیہ سید کے ناول غبار میں نفسیاتی اور فلسفیانہ عناصر کا تجزیہ

اُردو ناول نگاری میں "پریم چند" کی حیثیت مسلم ہے۔"پریم چند" کے ناول نچلے طبقے کے معاشرتی مسائل کی بھرپوری عکاسی کرتے ہیں۔انھوں نے "گئودان" اور "میدانِ عمل" جیسے ناول لکھے جس میں انھوں نے ادب کو صحیح معنوں میں انسانی زندگی کا ترجمان بنایا۔"پریم چند" کے علاوہ ایسے بہت سے لوگوں کے نام لیے جا سکتے ہیں جنھوں نے اپنے ناول فلسفے اور نفسیات کے زیرِ اثر لکھے۔ مثلاً اس دور میں "سجاد ظہیر"، "مرزا محمد سعید"، "عزیز احمد" اور "عصمت چغتائی" کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ "مرزا محمد سعید" کا ناول "خوابِ ہستی" شعوری طور پر فلسفہ اور نفسیات کے زیرِ اثر لکھا گیا۔اسی طرح ان کا دوسرا ناول بھی اہم ہے، "عزیز احمد" کے علاوہ "عصمت چغتائی" کے ناولوں میں نفسیاتی کشمکش دکھائی دیتی ہے۔"عصمت چغتائی" نے فرائڈ کے نظریات کو اپنے افسانوں میں جگہ دی۔ یہ تمام ناول آزادی سے پہلے لکھے گئے ان ناولوں کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے۔اس وقت کا ادیب نفسیات نگاری سے مکمل آشنا تھا۔ جن کا واضح ثبوت ان کی تخلیقات میں دیکھا جا سکتا ہے۔آزادی کے بعد لکھنے والوں میں "حجاب امتیاز علی"، "سعادت حسن منٹو"، "قراۃ العین حیدر"، "راجندر سنگھ بیدی"، "ممتاز مفتی"، "خدیجہ مستور"، "عبداللہ حسین"، "انتظار حسین"، "اکرام اللہ"، "بانو قدسیہ"، "شمس الرّحمٰن فاروقی" اور "مرزا اطہر بیگ" کے نام سرِ فہرست ہیں۔

برصغیر کی تقسیم نے اُردو ادب پر گہرے اثرات مرتب کیے۔فسادات اور ہجرت سے پیدا ہونے والے مسائل ادب کا موضوع بن گئے۔ انسان دوستی قدریں ناپید ہو گئیں۔ ہجرت کے مسائل نے نفسیاتی مسائل کو جنم دیا جس کے نتیجے میں تحلیلِ نفسی کو اس کے حل کے لیے پیش کیا گیا۔ "حجاب امتیاز علی" نے اپنے ناول "اندھیرا خواب" میں تحلیلِ نفسی کو بنیاد بنایا۔ "سعادت حسن منٹو" نے اپنے ناول "بغیر عنوان کے" میں ایک 20 سالہ نوجوان کی جنسی و جبلّتی ضرورتوں کو بیان کیا ہے۔ "قراۃ العین حیدر" کا ناول "آگ کا دریا" تاریخی حوالے سے اہم ہے۔ "راجندر سنگھ بیدی" کے ناول "اک چادر میلی سی" میں بیوہ عورت کی نفسیاتی کشمکش کو اور اس کے جنسی تقاضوں کو پورا کیا ہے۔ "ممتاز مفتی" کا "علی پور کا ایلی" ایک نفسیاتی مطالعہ ہے ناول "آنگن" میں

ادھوری آرزوؤں اور شکست خوردہ شخصیات کے مسائل کو پیش کیا گیا ہے۔ "اُداس نسلیں" میں قیامِ پاکستان سے پہلے اور بعد کے واقعات کا ذکر ملتا ہے۔ "انتظار حسین" کے ناول ناستیلجیا کے حوالے سے اہم ہیں۔ "اکرام اللہ" کے ناول "گرگِ شب" کا تعلق اوڈی پس جیسے روّیے سے ہے۔ "بانو قدسیہ" کا ناول "راجہ گدھ" حلال و حرام کے موضوع پر ہے جبکہ "کئی چاند تھے سرِ آسماں" اور "غلام باغ" میں فرد کی ذہنی اور نفسیاتی پیچیدگیوں کو بیان کیا گیا ہے۔

ناول غبار کا تعارف

عطیہ سید کی ہمہ جہت شخصیت کا ایک پہلو ناول نگاری بھی ہے۔ اگرچہ ان کا بنیادی میدان افسانہ نگاری ہے تاہم انھوں نے ایک ناول "غبار" کے نام سے لکھا۔ اس ناول کی وضاحت اس ناول کے آغاز میں موجود نثری نظم کرتی ہے۔

"کہکشاں کی شکست وریخت میں

وقت کے غبار میں

سمتیں ہیں بے نشاں

پاؤں تلے زمیں، نہ سر پہ آسماں

فاصلے ہیں لامکاں

دوریاں ہیں لازماں

نظر ہے دھند دھند، جذبے دھواں دھواں"

عطیہ سید کا ناول "غبار" 2012ء میں منظرِ عام پر آیا۔ جس کو سنگِ میل پبلی کیشنز نے شائع کیا۔ یہ ناول 144 صفحات پر مشتمل ہے۔ اس ناول کی چودہ فصلیں ہیں۔ ہر فصل میں ایک الگ کہانی چھپی دکھائی دیتی ہے۔ یہ ایک نفسیاتی و جنسی مطالعہ ہے۔

"غبار" میں ایک پاکستانی گھریلو کہانی بیان کی گئی ہے۔ یہ ناول ایک نفسیاتی و جنسی مطالعہ ہے۔ یہ ایک ایسے گھرانے کی کہانی ہے۔ جن کا باپ ان کو چھوڑ کر باہر کے ملک چلا جاتا ہے۔اور ایک پاکستانی لڑکی سے شادی کر لیتا ہے۔ یہاں ان کے بچے باپ کے چلے جانے کے بعد ذہنی الجھنوں کا شکار ہو جاتے ہیں۔ یہ عام مشاہدے کی بات ہے کہ جب بچوں کا ماں باپ یا ان میں سے کسی ایک کا پیار نہیں ملتا تو وہ بہت سے نفسیاتی اور ذہنی مسائل کا شکار ہو جاتے ہی۔ ان میں اعتماد کی کمی واقع ہو جاتی ہے۔ وہ اپنی صلاحیتوں کا کھل کر اظہار نہیں کر پاتے۔اس طرح ان کی شخصیت کی تعمیر نہیں ہو پاتی۔ جب انھیں والدین کی محبت نہیں ملتی تو وہ یہی محبت دوسروں میں تلاش کرنے لگتے ہیں۔ایسے بچوں کی حسّاسیت انھیں کمزور اور بزدل بنا دیتی ہے۔

"غبار" بھی ایک ایسی نفسیاتی کہانی پر مبنی ناول ہے۔ جو مرکزی کردار علی کے گرد گھومتا ہے۔ علی کے اندر نسوانیت پائی جاتی ہے۔ وہ کمزور اعصاب کا مالک انسان ہے۔ علی اور اس کا بھائی حسین اپنی ماں کے ساتھ رہتے ہیں۔ علی کا باپ دس سال پہلے دوسری شادی کر کے انھیں اکیلا چھوڑ کر باہر کے ملک چلا جاتا ہے۔اس وقت علی بہت چھوٹا تھا اور اس کا بڑا بھائی حسین بی ایس سی کر رہا تھا۔ باپ کے جانے کے بعد دونوں ذہنی پریشانی کا شکار ہو جاتے ہیں

شروع میں علی حفصہ نامی لڑکی سے محبت کرتا ہے مگر یہ محبت ناکام رہتی ہے اور حفصہ کی کہیں اور شادی ہو جاتی ہے۔ یوں علی اپنی ہر ناکامی پر حفصہ کو یاد کرتا ہے۔ کیونکہ علی میں جب سے شعور بیدار ہوا تھا حفصہ ہی وہ واحد لڑکی تھی جس نے علی سے محبت کا اظہار کیا تھا۔ مگر اب اس کے جانے کے بعد علی خود کو تنہا محسوس کر رہا تھا۔ علی کے فلائینگ کورس کے دوران اس کا واسطہ بابر سے پڑتا ہے۔ بابر اور علی ایک دوسرے کے لیے ایک خاص لمس محسوس کرتے ہیں۔ دونوں بہت اچھے دوست بن جاتے ہیں۔ بابر کا ساتھ علی کے ذہن سے حفصہ کی یاد مٹانے میں کامیاب ہو جاتا ہے لیکن بہت جلد بابر اپنا فلائینگ کورس مکمل کر کے چلا جاتا ہے اور علی ایک بار پھر اکیلا ہو جاتا ہے۔ بابر کے بعد وہ عثمان کے لیے خاص جذبات محسوس کرتا ہے مگر علی اس کی طرف زیادہ راغب نہیں ہوتا۔ علی فلائینگ کورس میں ناکامی کے جب گھر واپس آ جاتا ہے تو یہاں اس کی امی کے کزن کا بیٹا جمی اس کا

دوست بنتا ہے۔ جس کے ساتھ اس کی دوستی آخر تک رہتی ہے۔ کچھ عرصہ یہ دونوں ایک دوسرے سے ناراض رہتے ہیں لیکن جلد راضی ہو جاتے ہیں۔ علی کو جمی کا ساتھ بہت سکون دیتا ہے۔

علی کے اندر کی نسوانیت اس کو کمزور، بزدل اور ڈرپوک بنا دیتی ہے۔ وہ خود کو عجیب مخلوق سمجھنے لگتا ہے۔ وہ لوگوں سے خوف کھاتا ہے۔ اس کے لاشعور میں ایک خیالی کردار ننجا(Ninja) گھومتا رہتا ہے۔ جو وقتاً فوقتاً علی پر حملہ آور ہو کر اس کو زیر کرنے کی کوشش کرتا رہتا ہے۔ لیکن علی بہت جلد اپنی ان نفسیاتی کیفیات پر قابو پا لیتا ہے اور اپنی زندگی میں واپس آجاتا ہے۔ یہ سب کچھ مس ڈینیل کی وجہ سے ممکن ہوتا ہے جو کہ علی کے سکول کے زمانے کی استاد تھیں۔ وہ علی کو یہ باور کرانے میں کامیاب ہو جاتی ہیں کہ وہ سب سے الگ شناخت کا حامل انسان ہے اس کی الگ حیثیت اور پہچان ہے اور کسی کو یہ حق نہیں کہ وہ اس سے اس کا حق چھین لے۔ علی اپنی زندگی سے ماضی کا غبار اتار پھینکتا ہے اور مسرت بخش زندگی کا آغاز کرتا ہے۔

فکری و فنی تجزیہ

عطیہ سید نے مرد کی مرد میں دلچسپی کو کمال خوبی سے اپنے ناول میں بیان کیا ہے۔ ناول میں **کرداروں کا** تنوع زیادہ نہیں ہے۔ کم و بیش پندرہ کرداروں سے قاری کا واسطہ پڑتا ہے۔ جن میں سے آٹھ مردانہ کردار ہیں باقی نسوانی کردار ہیں۔ کرداروں کی تفصیل یہ ہے۔

علی	مرکزی کردار
حسین	علی کا بڑا بھائی
ماں	علی کی ماں
باپ	علی کا باپ
نانی	علی کی نانی
تسنیم	حسین کی معشوقہ

کیڈٹ بابر علی کا پہلا دوست

کیڈٹ عثمان علی کے بیج کا کیڈٹ

دو لڑکیاں (زہرہ اور اس کی دوست) اکیڈمی میں تقریری مقابلے کے لیے آتی ہیں۔

جمی علی کی ماں کی کزن کا بیٹا جو بعد میں علی کا اچھا دوست بن جاتا ہے۔

نرگس جو علی کو اپنی طرف ملتفت کرنے کی کوشش کرتی ہے۔

مس ڈینیل علی کی بچپن کی استاد

کیڈٹ عدنان جو اپنے دوستوں کو لڑکیوں کی طرف سے موصول ہونے والے محبت نامے فخر سے سناتا ہے۔

کیڈٹ سمیع کیڈٹ عدنان کا دوست

سکوارڈن لیڈر حبیب علی کا پرواز کے دوران انسٹرکٹر

اس کے علاوہ ایسے بہت سے کردار ہیں جن کا محض نام لیا گیا ہے یا جنھوں نے کوئی مکالمہ ادا نہیں کیا:

حفصہ علی کی پہلی محبت

زیشان ماموں علی کے سوتیلے ماموں

ننجا (خیالی کردار) جو علی کو خیالوں میں زیر کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

کیڈٹ عدیل جو علی سے سنیئر ہے اور سکوارڈن لیڈر محمود کے کہنے پر علی کو سزا دیتا ہے۔

سکوارڈن لیڈر محمود جو علی کی غلطی پر اسے سخت سزا دیتا ہے۔

مکالمہ نگاری بھی ایک فن کا درجہ رکھتی ہے۔ مکالمہ نگاری کے لیے یہ بات لازمی ہے کہ مکالمہ ہر صورت کردار کی حیثیت کے مطابق ہو۔یعنی کردار جو بھی مکالمہ ادا کرے وہ اس کے پیشے، طبقے، جنس اور نفسیات کے عین مطابق ہو۔ کردار کا مکالمہ اس کے معاشرے میں اس کے مقام اور مرتبے سے گہرا تعلق رکھتا ہو۔ کردار کا مکالمہ اس کے پورے پس منظر کی نمائندگی کرتا دکھائی دے۔عطیہ سید کے کرداروں کے مکالمے سیدھے سادھے، اور روزمرہ کے عین مطابق ہیں۔ان میں کسی قسم کا ابہام نہیں پایا جاتا۔ان کے مکالموں سے نہ صرف کرداروں کی اندرونی کیفیت کا برملا اظہار ہوتا ہے بلکہ کرداروں کی خواہشات اور مقاصد بھی واضح ہو کر سامنے آتے ہیں۔

"""تمہارے والد ہیں—گھر پر؟"

اس شخص نے علی کے بجائے مکان کے دروازے کو مخاطب کرتے ہوئے سوال کیا۔

"جی ہیں۔"

"ان سے کہو کہ کوئی ان سے ملنے کے لیے آیا ہے۔"

"آپ—کا نام؟"

اجنبی نے علی کو بیخ کر دینے والی نظروں سے دیکھا۔ علی ان نگاہوں کی تاب نہ لا سکا۔
حسبِ معمول اس کی زبان کچھ لڑکھڑا گئی۔

"میرا— مطلب— ہے —میں— کیا— کہوں— کہ— کو— کون—
مل—نے آیا ہے۔"

"کچھ بھی نہیں۔بس ایک ملاقاتی۔"[1]

لہجے کا اتار چڑھاؤ بھی ان کی کہانی میں خوبصورتی میں اضافہ کرتا ہے۔ غم، غصّہ، محبت اور نفرت کے اظہار کے لیے مخصوص لب ولہجہ اختیار کیا گیا ہے۔ کسی ٹی وی ڈرامے میں مکالموں کا لب ولہجہ کے مطابق ادا کرنا آسان ہوتا ہے۔ مگر ایک کہانی میں یہ سب دکھانا قدرے مشکل دکھائی دیتا ہے۔ یہ کہانی نگار کا کمال ہے کہ وہ

کہانی میں لب ولہجے کا کس طرح خیال رکھتا ہے۔ عطیہ سید اس فن میں کمال مہارت رکھتی ہیں۔ وہ کرداروں کے مکالموں کو ان کے مخصوص لب ولہجے میں ادا کرواتی ہیں۔ جن سے کردار کی شخصیت کھل کر سامنے آجاتی ہے۔

"""خاتون میں آپ کو ایک نہایت ہی اندوہناک خبر دینے والا ہوں"

امی اور علی کے وجود تن سے گئے۔

"آپ کے شوہر—؟"

اجنبی رک سا گیا۔

"جی۔"

امی ہمہ تن گوش تھیں۔

"آپ کو معلوم ہے—وہ اس وقت کہاں ہیں۔؟"

"جی—امریکہ میں۔"

کسی نامعلوم خوف سے امی کی زبان لڑکھڑانے لگی۔

علی متوحش نظروں سے اجنبی کو گھور رہا تھا۔ اس کی چھٹی حس بتا رہی تھی کہ کوئی بم گرنے والا ہے۔

"جی ہاں، مگر وہ اس وقت امریکہ کی ایک جیل میں ہیں۔"[2]

افسانے میں مکالمے کا کام کہانی کو آگے بڑھانا ہوتا ہے۔ اس لیے یہ مکالمے کا کہانی سے ربط رکھنا انتہائی ضروری ہے۔ اچھے اور جاندار مکالموں سے نہ صرف کہانی کے پلاٹ میں تحریک پیدا ہو جاتی ہے بلکہ اس کے ساتھ موضوع اور معنی بھی کھل کر سامنے آتے ہیں۔ معیاری فکشن میں مکالمے کی آمد نہیں ہوتی بلکہ یہ کہانی کے آگے بڑھانے کے لیے ہوتا ہے۔ حقیقت سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ المختصر مکالمے کردار کی خواہش اور مقصد کے عین مطابق ہونا چاہیے۔

اسلوب اس طریقہ کار کو کہتے ہیں۔ جس کے ذریعے الفاظ اور جملوں کو استعمال کیا جاتا ہے۔ اسلوب کو قدرتی انداز میں ہی چلنے دینا چاہیئے۔ اگر اس میں ذرا سی بھی بناوٹ یا مصنوعی پن جھلکتا دکھائی دے تو تحریر کھوکھلی دکھائی دینے لگتی ہے۔ زبان کی سادگی سے ہی قاری تک تخلیق کار کا اصل مقصد پہنچ سکتا ہے۔ اس کے برعکس کہانی کی زبان ثقیل و دقیق الفاظ سے پُر ہے تو کہانی کہیں کھو سی جائے گی۔

"کیا بات ہے علی؟"

"کچھ بھی نہیں۔"

"نہیں یار! کچھ تو ہے تم میرے ساتھ ہوتے ہوئے بھی میرے ساتھ نہیں۔"

"نہیں، ایسا نہیں ہے۔"

"کچھ تو ہے، جس کی رازداری ہے ـــــ اچھا ـــــ چلو مجھے اندازہ لگانے دو۔ میرا خیال ہے ـــــ تم حسین بھائی کی وجہ سے پریشان ہو۔ اصل قصّہ کیا ہے؟ حسین بھائی نے اپنی یہ حالت کیوں بنا رکھی ہے؟"

"بس ویسے ہی ـــــ ان کی طبیعت ناساز ہے،"[3]

ایک اور مثال دیکھیے۔

"جمی کی آواز کھانے والے کمرے سے آئی تو علی نے فوراً نلکا بند کر دیا کہ بہتے ہوئے پانی کی آواز سے اسے پتا نہ چل جائے کہ وہ غسل خانے میں ہے۔ جمی نے امی سے علی کے بارے میں پوچھا۔ امی نے علی کی ہدایت کے مطابق کہہ دیا کہ وہ گھر پر موجود نہیں، اگرچہ ایسا کہنے میں انہیں تامل اور توقف محسوس ہو رہا تھا۔ علی کو معلوم تھا کہ انہیں یہ چھوٹا سا جھوٹ بولتے ہوئے کس قدر تکلیف ہو رہی تھی کہ ان کا تعلق ایسے گروہ سے تھا، جو اب بھی موجودہ زمانے میں بھی دیانت داری اور سچ پر ایمان رکھتا تھا۔"[4]

عطیہ سید کی **کہانی میں روانی** ہوتی ہے۔ خوب صورت اور مختصر جملوں کا استعمال ان کے اسلوب میں نکھار پیدا کرتا ہے۔ کہیں بھی قاری بوریت کا شکار نہیں ہوتا۔

"علی اپنے کمرے میں گیا، جو گرز اتار کر پلنگ کے نیچے پھینک دیے اور پلنگ پر لیٹ گیا۔اس کا دل بے طرح دھڑک رہا تھا۔خون شریانوں میں دوڑتے ہوئے اس کے سر میں جمع ہو رہا تھا۔ وہ اس ہیجانی کیفیت سے چھٹکارا پانے کے لیے اٹھا اور ننگے پاؤں غسل خانے میں گیا۔اس نے سنک کے اوپر لگے آئینے میں چہرہ دیکھا تو اپنے بجائے ایک اجنبی صورت نظر آئی۔ اس نے ٹھنڈے پانی کا نلکا کھولا اور منہ پر چھینٹے دیے تاکہ اندر کی آتش فشانی کا اثر کم ہو جائے۔کافی دیر چہرے پر پانی پھینکنے کے بعد اسے قدرے سکون کا احساس ہوا۔ تپتے ہوئے پاؤں کے تلوے بھی غسل خانے کے سرد فرش کے مس سے ٹھنڈک محسوس کر رہے تھے۔"[5]

منظر نگاری کا کام کہانی کی صورت حال کو ایک خوب صورت سہارا دینا ہوتا ہے جس کے قاری کہانی کے ماحول سے پوری طرح آگاہ ہو جاتا ہے۔ مگر ضرورت سے زیادہ منظر نگاری کہانی کی اہمیت و افادیت کو کم کر دیتی ہے۔اور قاری اصل متن سے دور ہو جاتا ہے۔ عطیہ سید کے ہاں منظر نگاری کے عمدہ نمونے ملتے ہیں۔اس حوالے سے ڈاکٹر اے بی اشرف لکھتے ہیں:

عطیہ سیّد کے ہاں "فطرت کے حوالے تواتر کے ساتھ ملتے ہیں۔ فضا اور منظر کی تصویر کشی بہت خوبصورت انداز میں کرتی ہیں"۔[6]

عطیہ سید کے ناول میں کئی مقامات پر منظر نگاری کی تصویر کشی کی گئی ہے، مثلاً

"دھوپ کھل کر چمکنے لگی تھی۔ موسم بدل چکا تھا۔ فضا کھٹی میٹھی بھینی بھینی خوشبوؤں سے مہک اٹھی تھی۔ درخت سر سبز ہو چکے تھے۔ کیاریوں میں ڈیلیا اور گلاب کھلے ہوئے تھے۔"[7]

ایک اور مثال دیکھیے۔

"علی معطل ہونے کے بعد لاہور پہنچا، تو بہار کے دن تھے۔ فضا پھولوں کی خوشبو سے مہک رہی تھی۔ ہوا میں سرمستی تھی۔ ٹریفک کے شور کے باوجود پرندوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ لیکن علی اس پُر بہار شہر میں ایک ایسے سپاہی کی طرف لوٹا، جس کی تلوار ٹوٹ چکی ہو۔"[8]

ان کے ہاں خوب صورت **تشبیہات واستعارات** کا ستعمال بھی ملتا ہے۔ جو ان کی تحریروں میں دلکشی کا باعث بنتا ہے۔ عطیہ سید مختصر اور جان دار بات کہنے کی عادی ہیں۔ بہت زیادہ تفصیل سے بچنے کے لیے انھوں نے خوب صورت علامتوں کا بھی استعمال کیا ہے۔ انھوں نے "نیلا رنگ" موت کی علامت کے طور پر استعمال کیا ہے۔ مثلاً دیکھیے۔

"آج میرے وجود کے ہر زاویے سے بھی کرب پھوٹ رہا ہے—اندھے گٹارسٹ کی طرح۔ اس کے گرد پھیلے نیلے رنگ کی طرح میرے گرد بھی نیلاہٹ ہے—نیلے زہر کی طرح۔"[9]

ایک اور مثال دیکھیے۔

"علی کی رنگت دودھیا تھی اور بابر کی ساہی مائل۔ اس نسبت سے کئی شرارتی لڑکوں نے انہیں رضیہ سلطان اور یاقوت حبشی کی جوڑی قرار دے دیا۔ بعض ایسے بھی تھے جو بابر کو اس کا Negative کہتے تھے۔ اگر کبھی کبھار بھولے سے علی اکیلا ہو تو فوراً اس سے سوال کرتے۔ "بھئی! وہ تمہارا Negative کہاں ہے۔"[10]

عطیہ سید کو **نفسیات نگاری** پر مکمل عبور حاصل ہے۔ انھوں نے کرداروں کی نفسیات کو فلسفیانہ انداز میں پیش کیا ہے۔ اپنی کہانیوں میں بیک وقت نفسیاتی اور فلسفیانہ انداز ان کی تحریروں کی پہچان بنتا دکھائی دیتا ہے۔ قاری کہیں بھی کوئی تحریر پڑھ کر اندازہ لگا سکتا ہے کہ یہ عطیہ سید کی تحریر ہے۔ یہ خاص وصف انھیں سے منسوب ہے۔

"Atiya Syed writes good prose, understands human psychology and has an aptitude to make her fiction interesting" [11]

ناول غبار میں نفسیاتی عناصر

داخلی حقیقت نگاری

ناول "غبار" میں علی کی شخصیت میں کئی دوسری خامیوں کے علاوہ ایک نفسیاتی بیماری نرگسیت(Narcissim) بھی پائی جاتی ہے۔نرگسیت سے مراد الفتِ ذات یا خود پسندی ہے۔ نرگسیت کی تعریف تشریحی لغت میں اس طرح کی گئی ہے۔

"تحلیلِ نفسی کی اصطلاح میں یہ لفظ اپنی ذات سے انتہائی الفت کے لیے استعمال ہوتا ہے۔" [12]

نفسیاتی سطح پر نرگسیت کی دو قسمیں بیان کی جاتی ہیں۔ پہلی قسم کا تعلق انسانی جسم اور جسم سے جڑی ہوئی جنسی کیفیات سے ہے۔ جبکہ دوسری قسم کو انسانی ذہن سے جوڑا جا سکتا ہے۔اس حالت میں انسان اپنی ذات سے وابستہ کارناموں اور مقاصد پر فخر محسوس کرتا ہے۔ علی کی شخصیت میں یہ دونوں قسمیں پائی جاتی ہیں۔

"جمی کی قربت نے علی کو بہت سی چیزیں بخشی تھیں ـــــ بہت سی نئی کیفیات سے روشناس کروایا۔۔۔ محبت کے وہ اظہار جو اسے کلیشے دکھائی دیتے تھے، اب سچے اور حقیقی معلوم ہوتے تھے۔ ان سب احساسات سے بڑھ کر یہ کہ اسے زندگی میں پہلی مرتبہ اپنے جسم کے ہونے کا احساس ہوا تھا۔اس سے پہلے وہ دوسروں کی زبانی اپنی خوش شکلی کا ذکر سنتا تھا، لیکن اس نے کبھی یہ محسوس نہیں کیا تھا کہ وہ سچ مچ دلکش ہے۔اب اسے اپنے جسم کے ہر حصّے کے حسن کا شعور ہو چلا تھا۔" [13]

علی کے ذہن میں جمی کے ساتھ تعلق کے بارے میں کئی سوالیہ نشان اُبھرتے۔اور وہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا۔

> "پھر وہ سوچتا، کیا وہ صرف دوست ہیں——یا اس سے بڑھ کر کچھ ؟اس نقطے پر پہنچ کر اس کی سوچ رک سی جاتی تھی۔ شاید وی لاشعوری طور پر اس سرحد کو عبور نہ کرنا چاہتا تھا۔اسے مبہم سا احساس تھا کہ اس سے آگے کوئی خطرہ تھا——کوئی پھندہ لگا تھا جس میں پھنس کر شاید وہ اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے، لیکن اس اندیشے کے باوجود اس کے اندر چھپی کوئی عفریت بعض دفعہ اس کے کان میں سرگوشی کرتی——"کہیں میں وہ تو نہیں"اور وہ فوراًاس سوچ کا گلا گھونٹ دیتا۔"[14]

عطیہ سید نے اس ناول میں نفسیاتی نقطہ ء نظر سے خانگی زندگی کی پریشانیوں، نفسیاتی الجھنوں اور جنسی تشنگی کو بیان کیا ہے۔ یہ عطیہ سید کا خاص وصف ہے۔ محبت ایک فطری اور بنیادی جذبہ ہے۔ جو ہر انسان میں پایا جاتا ہے۔ قدرتی طور پر ہر انسان میں مثبت اور منفی جذبات پائے جاتے ہیں۔ مس ڈینیل کا کردار نفسیات دان کے روپ میں سامنے آیا ہے۔ وہ بخوبی جانتی ہیں کہ کون سے الفاظ اور روّیے سے علی کے خیالات کو تبدیل کیا جاسکتا ہے۔

خواب کی انسانی زندگی میں بہت اہمیت ہے۔انسان حقیقت سے زیادہ خواب کی دنیا میں زندگی بسر کرتا ہے فرائڈ خوابوں اور اشاریت کے درمیان ربط قایم کرتا ہے۔ خواب چونکہ ہماری اصل زندگی کا مخفی حصّہ ہوتے ہیں۔اس لیے خواب ہر صورت ہماری انسان کی زندگی پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ علی کو بھی پریشانی کی حالت میں خواب میں ایک خیالی کردار نجاد کھائی دیتا ہے۔ علی ہر خواب میں نجا کو دیکھنے کے بعد پہلے سے بھی زیادہ ناامیدی میں مبتلا ہو جاتا تھا۔ وہ لاشعوری طور پر خواب کی کیفیت سے خود کو آزاد کرانے میں ناکام رہتا ہے۔ خواب اور حقیقت کے واقعات اس کو سوچنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ وہ ان سب سے خوفزدہ دکھائی دیتا ہے۔اسے کوئی بھی بہتری کی صورت دکھائی نہیں دیتی۔ اس حالت کو انگریزی میں Decidophobia کہتے ہیں۔ اس سے

مراد ایسی حالت ہے جس میں انسان کسی بھی قسم کا حتمی فیصلہ کرنے میں ناکام رہتا ہے۔ وہم اور وسوسے اس کے ہر فیصلے کو کمزور کر دیتے ہیں۔ علی بھی اس قسم کی کیفیت کا شکار ہے۔ وہ مس ڈینیل کے لاکھ سمجھانے پر بھی پُر امید دکھائی نہیں دیتا۔اور ناامیدی کی دلدل میں دھنستا چلا جاتا ہے۔

"جب علی تھکن سے نڈھال، اپنی چیتا جیسی سوچوں سے خائف اور اپنے کٹار سوالوں سے چھلنی خوابوں میں اترتا تو اس کا شعور معطل ہو جاتا، لیکن اس کے ذہن کے پاتال سے جمال کی شبیہہ اُبھرتی۔ کبھی اس شبیہہ کا صرف دھڑ ہوتا——اور کبھی اس دھڑ پر علی کا سر جڑا ہوتا۔ جمال، علی بن جاتا——یا پھر علی، جمال کا روپ اختیار کر لیتا۔"

"ایک رات علی نے دیکھا شہاب ثاقب کی طرح زمین کی طرف چھوٹا جا رہا ہے۔ طیارے کے گرد تیرتی پھڑ پھڑاتی ہوا خاموش ہو گئی ہے۔ جمال، علی ہے اور اس کے سینے میں دل یوں ساکت ہے، جیسے تابوت میں لاش۔ وہ ایویشن سوٹ میں ملبوس ہیلمٹ پہنے، شفاف کینوپی سے آسمان کی نیلگوں وسعتوں میں بکھرے ستارے دیکھ رہا ہے——حالانکہ سامنے اس کا مقدر——زندگی کا ناگزیر انجام——فنا ہے۔"[15]

علی اسی تذبذب اور کم ہمتی کی کیفیت میں پرواز کی مشق میں ناکام ہو جاتا ہے اور معطل کر دیا جاتا ہے۔ علی کی ماں جس کو صرف علی امید کی کرن دکھائی دیتا تھا، پھر سے مایوس ہو جاتی ہیں۔یوں ایک دفعہ پھر پورا گھر ذہنی اور نفسیاتی کشمکش کا شکار ہو جاتا ہے۔ علی کی پرواز کے دوران نفس پر جو کیفیت گزرتی ہے اس کو عطیہ سید کس طرح بیان کرتی ہیں دیکھیے۔

"سکوارڈن لیڈر حبیب، علی کو کچا چبا جانے والی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ علی شرمساری سے شرابور تھا۔ کسی اور نے بھی اسے اس سے ملتی جلتی گالی دی تھی۔اس کا سر گھومنے لگا۔ دل سینے میں زخمی پرندے کی طرح پھڑ پھڑانے لگا۔ یکدم ساتھ والی سیٹ پر بیٹھا سکوارڈن لیڈر حبیب زہرا میں تبدیل ہو گیا، جو اس کا منہ چڑا رہی تھی۔اس کے چہرے

پر شیطنت تھی اور ہاتھ میں بھالا۔ پھر اس کی آواز انتہائی شدت سے علی کے کانوں کے پردے سے ٹکرائی۔

"کہیں آپ وہ۔۔۔تو نہیں؟"

زہرا کا ظالم قہقہہ فضا میں بلند ہوا۔ طیارہ ڈولنے لگا۔

اچانک زہرا نے سمیع کی جون اختیار کر لی۔ "لڑ۔۔۔۔کیا۔۔۔۔۔ں" سمیع نے علی کا تمسخر اڑایا۔

"چغد۔۔۔" کہیں سے کوئی پکارا۔

سکوارڈن لیڈر حبیب کی گرج سنائی دی۔ "نامرد"

طیارہ قلا بازیاں کھانے لگا ایک۔۔۔دو۔۔۔تین۔۔۔چار، علی کا کلیجہ منہ کو آنے لگا۔"[16]

علی کو جب بھی کوئی طنز کا نشانہ بناتا۔ یا اس کی کمزوری کو بھانپ کر باتوں کا وار کرتا تو ایسی حالت میں علی عموماً لکنت زدہ ہو جایا کرتا تھا۔ مثلاً زہرا کا "کہیں آپ وہ تو نہیں" کہنا، کیڈٹ سمیع کا "لڑ۔۔۔کیا۔۔۔۔ں" کہہ کر مذاق اڑانا، یا سکوارڈن لیڈر حبیب کا علی کو نامرد کہہ کر اس کی عزت نفس کو تار تار کرنا۔ یہ سب باتیں ایسی تھیں کہ علی گھبرا جاتا اس کو کوئی جواب نہ سوجھتا۔ وہ عموماً ایسی جگہوں سے بھاگ کھڑا ہوتا تھا۔ مثلاً کیڈٹ عدنان ایک کمرے میں بیٹھا اپنے دوستوں لڑکیوں کی طرف سے ملنے والے خطوط کو پڑھ کر سنا رہا ہوتا ہے تو کمرے کے دروازے سے علی کو گزرتا دیکھ کر اس کو اند آنے کا کہتے ہے اور مختلف سوالوں سے اسے تنگ کرتے ہیں۔ مثلاً

"آؤ، آؤ، علی!" عدنان نے علی کو پکارا۔

"یار تم کیوں نہیں ہمارے کلب کے ممبر بنتے۔" عدنان نے پوچھا۔

"کلب۔۔۔؟" علی نے سوالیہ انداز میں کہا۔

"ہاں، بس شرط صرف یہ ہے کہ تمہیں اپنی فتوحات کی یہاں سب کے سامنے رپورٹ پیش کرنی ہو گی۔"

"فتوحات ـــ؟رپورٹ ـــ؟"

علی پریشان سا ہو گیا۔

علی بات یہ ہے کہ تمہاری جن لڑکیوں سے دوستی ہے،ان کے بارے میں تفصیل سے بتانا ہو گا ـــ اور دستاویزی ثبوت کے طور پر ان کی جانب سے موصول ہونے والے خطوط کو اس کلب کی میٹنگ میں پڑھنا ہو گا۔"

علی سراسیمہ ہو گیا۔

"لڑ۔۔۔کیا۔۔۔ں۔"وہ ہکلانے لگا۔

لڑکے ہنسنے لگے۔

جانے بھی دو،عدنان! کس چغد سے بات کر رہے ہو۔"ایک لڑکے نے جملہ کسا۔"[17]

خارجی حقیقت نگاری

علی فطرتاً کمزور، بزدل اور ڈرپوک پیدا نہیں ہوا بلکہ خارجی حالات مثلاً حفصہ کا علی کو چھوڑ کر کہیں اور شادی کرنا، باپ کا انھیں اکیلا چھوڑ کر غیر ملک چلے جانا وغیرہ۔ یہ تمام واقعات ایسے تھے۔ جنھوں نے علی کے اندر طلاطم بپا کر دیا اور وہ ذہنی اور جسمانی طور پر کشمکش کا شکار ہو جاتا ہے۔

علی کئی مقامات پر بہادر اور پُراعتماد دکھائی دیتا ہے۔ مثلاً جب علی کے والد علی اور مس ڈینیل کے تعلق کو غلط رنگ دیتے ہیں تو علی کا پارہ ساتویں آسمان پر چڑھ جاتا ہے۔ علی کے اندر آتش فشاں پھٹ پڑتا ہے۔ وہ غصّہ سے لال پیلا ہو جاتا ہے۔ اور اپنے باپ جیسے ظالم شخص کے سامنے کلمہ حق کہہ ڈالتا ہے۔

"بس،ابو! بس۔اس سے آگے ایک لفظ بھی نہ کہیں۔"

"کیوں ـــ؟"ابو جوابی حملے کے لیے تُلے بیٹھے تھے۔

"کیوں کہ مس ڈینیل ایک باعزت اور قابل احترام خاتون ہیں۔ میں ان کی بڑی عزت کرتا ہوں اور ان کی شان میں گستاخی برداشت نہیں کر سکتا۔"[18]

علی کو خود بھی پتا نہیں چلتا کہ اس میں اتنی ہمت کہاں سے آئی۔ علی کی شدید غصّے کی حالت میں اس کے نفس پر کیا گزرتی ہے۔اس کا اظہار دیکھیے۔

"علی نے اپنے اندر کھولتے ہوئے لاوے پر قابو پانے کی——بند باندھنے کی کوشش کی، مگر اس کا جسم خود اپنے ہی قہر سے لرز رہا تھا۔ کھولتے ہوئے لاوے کے بے قابو ہونے سے پہلے ہی علی ڈرائینگ روم سے اپنے کمرے میں چلا گیا۔"[19]

علی کے باپ کا انھیں چھوڑ کر چلے جانا ان کے لیے بہت بڑی آزمائش تھا مگر ایک دن اچانک علی کی امی علی کو بتاتی ہیں کہ ان کا باپ واپس پاکستان آ رہا ہے تو یہ خبر علی پر ایٹم بم بن کر گرتی ہے۔ باپ کے آنے کے بعد ان کی زندگی سلجھنے کی بجائے مزید الجھ جاتی ہے۔ علی، حسین اور اس کا ماں کی شخصیت ایک معمہ بن کر رہ جاتی ہے۔ علی کا باپ علی کی ماں کو بات بات پر بے عزت کرتا ہے۔ وہ علی اور حسین کی تربیت پر انگلی اُٹھاتا ہے۔ وہ علی کی ماں کو بار بار طعنہ دیتا ہے کہ اس نے بچوں کی تربیت ٹھیک نہیں کی۔ وہ علی کی ہر سر گرمی کو شک کی نظر سے دیکھتا ہے۔علیاور اس کے گھر والوں کا آرام و سکون غارت ہو جاتا ہے۔

عطیہ سید نے علی کے نفسیاتی و جنسی مسائل پر بہت عمدہ قلم کاری کی ہے۔ علی کی کیڈٹ بابر کے ساتھ بہت اچھی دوستی تھی۔ بابر بھی علی کے لیے خاص لمس محسوس کرتا تھا۔ علی کو سکواڈرن لیڈر محمود نے جب سزا دی تو بابر کو علی سے بہت ہمدردی ہوئی۔ بابر کو علی بہت خوب صورت لگا۔

"بابر کو علی خاکی کیڈٹ وردی پہنے سر پر سائیڈ کیپ سجائے، وہاں چلچلاتی دھوپ میں کھڑا بے حد حسین دکھائی دے رہا تھا۔ ویسے تو علی کے نفیس نقوش اور دبلا پتلا جسم اس کے لیے ہمیشہ پُر کشش تھا۔ لیکن آج سنہری دھوپ میں دو تین گھنٹے کھڑے رہنے سے علی کی بے بس اور کرب سے مخمور آنکھوں نے اس کے دل کو اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔"[20]

بابر علی کے لیے خاص جذبات رکھتا تھا۔ علی بھی بابر میں دلچسپی لینے لگا تاکہ وہ اپنے دل سے حفصہ کی محبت نکال سکے۔ مگر علی بابر سے تھاڑا خائف رہتا تھا۔ علی سمجھتا تھا کہ ہر شخص محبت کرنے کے بعد چھوڑ کر چلا جاتا جاتا ہے۔ جیسا اس کے باپ نے کیا اور جیسا حفصہ نے اس کے ساتھ کیا۔ اور بابر کی محبت بھی وقتی ہے ختم ہو جائے گی اور واقعی ایک دن ایسا ہی ہوا۔ بابر فلائنگ کورس مکمل کرنے کے بعد اس کو چھوڑ کر چلا گیا۔ علی کو بابر کے چلے جانے کا زیادہ دکھ نہیں ہوا۔ کیونکہ وہ اس دکھ سے پہلے بھی کئی بار گزر چکا تھا۔

عطیہ سید کوئی بھی واقعہ بیان کرتے وقت خارجی مناظر کا سہارا لیتی ہیں۔ اسن مناظر کا پس منظر اس واقعہ کی دلکشی میں اضافہ کر دیتا ہے۔ مثلاً

"یکدم خاموشی سیاہ بادلوں کی طرح باغیچے میں اتر آئی۔ علی اور مس ڈینیل کے گرد گہرا سناٹا چھا گیا۔ علی کے عقب میں دیوار پر منڈھی عشق پیچاں کی بیل میں کوئی چڑیا پھدک رہی تھی۔ کچنار کے درخت پر کوئی پرندہ راگ الاپنے لگا۔ گلچیں کے سفید خوشبودار پھولوں کے گچھوں کی مہک علی کے نتھنوں میں تھی۔"[21]

وجودی اثرات

عطیہ سید کے ناول کا بنیادی موضوع ہی "وجودی" یعنی خود کو پالینا ہے۔ عطیہ سید نے ناول "غبار" میں اس سوال کا جواب تلاش کرنے کی کوشش کی ہے کہ اگر انسان خود وقت کے غبار میں بھٹک جائے تو کیا وہ کبھی خود کو بھی پا سکتا ہے؟ عطیہ سید کے ہاں وجودیت کی کئی مثالیں دیکھی جاسکتی ہیں۔ مثلاً

"بعض لوگ پالیتے ہیں کہ وہ اکثریت سے مختلف ہیں۔ اس راز کا بھیدی ہونے کے باوجود کچھ لوگ اکثریت کے سامنے پسپا ہو جاتے ہیں، کیونکہ اکثریت اپنے سے مختلف کبھی نہ تو معاف کرتی ہے اور نہ برداشت کرتی ہے، بلکہ انھیں دبانے کی پوری کوشش کرتی ہے، لیکن بعض افراد ایسے بھی ہوتے ہیں ـــــ جو ان کے سامنے سینہ سپر ہو جاتے

ہیں اور اپنے زندہ رہنے کے حق کو منوا لیتے ہیں ـــــ اپنے تشخص کو برقرار رکھتے ہیں۔"[22]

مس ڈینیل کی شخصیت انفرادیت کی حامل ہے۔ وہ اپنا الگ تشخص برقرار رکھے ہوئے ہیں۔ ایک موقع پر علی مس ڈینیل سے یہ دریافت کرتا ہے کہ ان کا ظاہر اور باطن بہت خوب صورت ہے پھر انھوں نے شادی کیوں نہیں کی اس کے جواب میں مس ڈینیل کہتی ہیں۔

"آسان لفظوں میں یوں ہے کہ میں نے اس لیے شادی نہیں کی کہ میں جانتی تھی کہ میرا مزاج شادی کے لیے موزوں نہیں۔ اس صورت میں شادی کرنا، ایک ایسا قدم اٹھانا تھا، جو ایک غیر ذمہ دارانہ فعل کے سوا کچھ نہ تھا۔ یہ بہت سے دوسرے افراد کو ایک اذیت ناک صورتِ حال سے دوچار کرنے کے مترادف تھا ـــــ اور اگر میں شادی کر بھی لیتی ـــــ اکثریت کا لیبل لگا کر اکثریت میں شامل ہونے کے لیے ـــــ تو ـــــ یہ خودکشی کرنے کے برابر تھا۔ میرا تشخص تو صرف ـــــ اسی صورت قائم رہ سکتا تھا کہ میں اکثریت کے سامنے ہتھیار نہ پھینکوں۔"[23]

وجودی اثرات کی ایک اور مثال دیکھیے۔

"علی افسردہ تھا ـــــ اور افسردہ ہو گیا۔

"اب بتاؤ کہ تم کیسے پاتال میں اترے؟"

"میں ابھی مجھے بہت کچھ سوچنا ہے فیصلہ کرنا ہے اپنے آپ کو پانا ہے۔"

"اگر تم نے پاتال کو چھو لیا ہے تو اب تم اور نیچے نہیں گر سکتے۔ تم یقیناً ابھرو گے اور یہ بازی تمہارے ہاتھ رہے گی۔"[24]

نیچرلزم اور تحلیل نفسی کے اثرات

عطیہ سید نے تحلیل نفسی کے زریعے کرداروں کے اندر جھانکا ہے اور کردار کے باطن میں اتر کر اس کی فطری جبلّتوں کو سمجھ کر کردار کی شخصیت سے مکمل تعارف کروایا ہے۔ عطیہ سید نے کرداروں کی موجودہ نفسیاتی الجھنوں کو ان کے ماضی کے واقعات سے جوڑا ہے۔ عطیہ سید نے علی کے کردار کی نفسیاتی الجھنوں کا تجزیہ اس کے ماضی کے واقعات سے جوڑ کر کیا ہے۔ علی بظاہر کمزور اور بزدل دکھائی دیتا ہے۔ لوگوں سے بات کرنے سے کتراتا ہے۔ عورتوں کی طرح کمزور اعصاب کا مالک ہے۔ کسی بھی ہنگامی حالت میں وہ لکنت زدہ ہو جاتا کرتا ہے۔ وہ نسوانیت اور نرگسیت کا شکار ہے۔ جہاں کوئی شخص اسے اس کی اس کمزوری کا طعنہ دیتا تو وہ وہاں سے بھاگ کھڑا ہوتا تھا۔ وہ اپنے آپ سے شرم محسوس کرتا ہے۔ نتیجتاً وہ ہر اُس شخص سے دور بھاگنے کی کوشش کرتا ہے۔ جو اسے اِس کمزوری کا احساس دلاتا ہے۔ اس کی حالت بگڑنے لگتی۔

علی کے کردار کا مطالعہ کیا جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ علی آغاز میں کمزور اور بزدل نہیں تھا اور نہ اس میں نسوانیت پائی جاتی تھی۔ وہ تمام تو نفسیاتی الجھنوں کا شکار اپنے باپ کے چلے جانے کے بعد ہوا۔ وہ اپنے آپ کو تنہا محسوس کرنے لگا۔ باپ کے جانے کے بعد علی کی کل کائنات اس کی ماں اور حسین بھائی تھے مگر اُن دونوں نے باپ کی بے وفائی کا اثر علی سے بھی بڑھ کر لیا۔ ماں نے ہمیشہ کے لیے چپ سادھ لی اور حسین بھائی وہ تو اللہ والے ہو گئے۔ وہ گھر میں بڑے تھے مگر انھیں گھر کی اقتصادی حالت کی زرا پرواہ نہیں تھی۔ وہ دن رات اللہ کی عبادت کرتے۔ مذہبی کتابیں پڑھتے۔

علی کی تمام تر نفسیاتی الجھنوں کا حل مس ڈینیل تحلیلِ نفسی سے کرتی ہیں۔ وہ علی کی ہر پریشانی کا حل تلاش کر کے علی کو پُر سکون کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔ وہ ایک ماہرِ نفسیات کی طرح علی کی الجھنوں کی سمجھ کر اس کو دلاسا دیتی ہیں۔ مس ڈنیل کا کردار ایک مضبوط کردار ہیں۔

علی کا کردار ارتقائی منازل طے کرتا ہے۔ وہ خود کو سمجھنے اور اپنے اندر اُٹھنے والے سوالوں کا جواب تلاش کرنے کے مس ڈینیل کے پاس جاتا ہے۔ اور کبھی وہ اکیلے تنہائی میں خود سے اپنی ذات کے متعلق سوال کرتا ہے

مگر اس کی سوچیں منتشر دکھائی دیتی ہیں۔ جو اس کے فیصلوں کو کمزور بناتی ہیں۔ منتشر خیالات کی اس حالت کو (Decid phobia) کہتے ہیں۔

علی کے خیالات و جذبات اس کو قنوطی بھی ثابت کرتے ہیں۔ اس کو دنیاوی معاملات میں خوشی اور اچھائی کو کوئی امید دکھائی نہیں دیتی۔ اور نہ ہی وہ اپنے مستقبل کے بارے میں پُرامید ہے۔

دوسری طرف باپ کے چلے جانے کا دُکھ حسین بھائی کے ذہنی کھچاؤ میں اضافہ کرتا ہے۔ حسین تنہائی اور بے چینی کی اذیت سے دوچار دکھائی دیتا ہے۔ وہ یہی محبت دوسروں میں تلاش کرنے نکلتا ہے اور اس کو یہ محبت رجو خالہ کی بیٹی تسنیم کی صورت میں مل جاتی ہے۔ مگر وہ بہت ساری محبتیں ایک ساتھ پانے کے چکر میں تسنیم کی دوست کو محبت نامہ لکھ ڈالتا ہے۔ اور تسنیم کی دوست وہ محبت نامہ تسنیم کو دکھا دیتی ہے اور یوں حسین کی محبت کا ڈراپ سین ہو جاتا ہے۔ اور تسنیم حسین سے اپنے تمام تعلقات ختم کر کے کسی اور سے شادی کر لیتی ہے۔ حسین ایک بار پھر اپنی تنہائی والی زندگی میں واپس آ جاتا ہے۔

ناول غبار میں فلسفیانہ عناصر

انسان بطور روحانی وجود

عطیہ سید نے مس ڈینیل کے کردار میں انسان کے روحانی روّیے پیش کیے ہیں۔ مثلاً جب مس ڈینیل علی کو رات کے کھانے کے لیے بلاتی ہیں تو کمرے کی حالت سے لے کر میز کی سجاوٹ تک ہر چیز میں روحانی روّیے دکھائی دیتے ہیں۔ بلب کی جگہ میز پر موم بتیاں جلی دیکھ کر علی حیران ہو جاتا ہے۔ مس ڈینیل اس کی حیرانی بھانپ کر کہتی ہیں۔

> "غالباً تم سوچ رہے ہو کہ کمرے میں موم بتیاں کیوں روشن ہیں، جب کہ ہم ایک بڑے اور بجلی کی سہولت سے آراستہ شہر کے درمیان بیٹھے ہیں۔ دراصل بجلی کی روشنی بڑی سنگدل ہوتی ہے۔ بڑی بے رحمی سے اشیاء کو عریاں کرتی ہے۔ جب کہ مام بتی کی

روشنی میں ایک حسن اور پُراسراریت ہے ——اور مجھے حسن اور پُراسراریت سے عشق ہے۔"

مس ڈینیل مذہب کے بارے میں کہتی ہیں۔

"مذہب —— بھئی یہ تو ایک بڑا ہی گھمبیر موضوع ہے، مگر ایک بات واضح کر دوں کہ ذاتی طور میں صرف مسلکِ انسانیت کی قائل ہوں۔ البتہ نجانے کیوں مجھے چرچ میں عجیب سا احساس ہوتا ہے —— سکون کا۔ میری سوچیں نکھر آتی ہیں۔ اور جذبے نتھر جاتے ہیں۔ بس ذہن کی دھندلاہٹ ہٹ سی جاتی ہے"[25]

انسان کی داخلی زندگی

عطیہ سید کا ناول انسانی زندگی کے کرب اور اذیت کی عکاسی کرتا ہے۔ اس ناول کا آغاز ہی انسانی دکھ، درد اور اذیت سے ہوتا ہے۔ مثلاً

"۔۔۔۔ علی کا سر یوں دُکھ رہا تھا جیسے کوئی بہت بڑا پھوڑا جس سے پیپ رسنے والی ہو۔ وقت کے پھسلتے لمحوں کے ساتھ اس کے جسم کی اکڑ اور سر کی دکھن دھند لانے سی لگی۔"[26]

اس پورے ناول میں علی مسلسل دکھ، پریشانی اور اذیت سے گزرتا ہے۔ وہ ہر طرح کے حالات کا سامنا کرتا۔ ہر مشکل سے لڑنے کی کوشش کرتا ہے مگر جب اسے اپنے باپ کی طرف سے یہ صدمہ ملتا ہے کہ وہ ایک سمگلر ہے تو یہ دکھ اس کے لیے قابل قبول نہیں ہوتا۔ وہ مسلسل اذیت اور پریشانی میں مبتلا رہتا ہے۔ ہر چیز سے اس کی دلچسپی ختم ہو جاتی ہے۔ وہ ہر کسی سے ملنے سے کتراتا ہے۔ بلا آخر وہ اپنی اس حالت سے نکل آتا ہے۔ اور مس ڈینیل کے سامنے اس بات کا اقرار کرلیتا ہے کہ وہ ایک سمگلر کا بیٹا ہے۔

""""آج میں آپ کو یہ بتانے آیا ہوں کہ میں ایک سگلر کا بیٹا ہوں۔ یہ بات مجھے خود کچھ عرصہ پہلے معلوم ہوئی ہے۔ لیکن میں اسے قبول کرنے کو تیار نہ تھا۔ اسی لیے میں نے

پہلے آپ کو یہ راز نہیں بتایا۔ میں خود اس حقیقت کو تسلیم کرنے کے لے آمادہ نہ تھا۔ میرے اندر مدافعت تھی، جس نے ایک ہیبت ناک کشمکش کو جنم دیا۔"

مس ڈینیل کو جھٹکا سا لگا۔

"یہ تم کیا کہہ رہے ہو۔"

"جو بھی کہہ رہا ہوں، سچ کہہ رہا ہوں۔"

"کیا فلمی قسم کی باتیں کر رہے ہو؟ تمہارے ــــ ابو ــــ اور سمگلر!"

"بعض دفعہ حقیقت فلم اور بعض فلم حقیقت ہوتی ہے۔" علی نے تلخ مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ "یہ ایک تلخ اور ناقابل تردید حقیقت ہے کہ میرا باپ سمگلر ہے ــــ اور وہ آج کل پاکستان سے ہیروئن سمگل کرنے کی پاداش میں امریکہ کی ایک جیل میں گل سڑ رہا ہے۔"[27]

علی ایک کے بعد ایک ذہنی مسائل کا شکار ہو جاتا ہے۔ اس کی نسوانیت ہر لمحہ اس کے لیے آزمائش کا سبب بنتی ہے۔ مثلاً زہرہ اور اس کی دوست جب علی سے ملتی ہیں تو ان کی طنزیہ باتوں سے علی پر کیا کیفیت گزرتی ہے۔ دیکھیے۔

"""علی! آپ لڑکیوں کی طرح نازک اور خوبصورت ہیں"

"جی ــــ جی ــــ؟ علی ہکلانے لگا۔

ایک شوخ و شنگ قہقہہ فضا میں بلند ہوا اور سخت بھاری پتھر کی طرح علی کے شرمیلے وجود پر آن گرا۔

"ویسے گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ آج کل ماچو قسم کے کڑیل جوانوں کے بجائے Pretty boys کا رواج ہے۔"

ابھی علی اس تیکھے وار سے سنبھلنے بھی نہیں پایا تھا کہ زہرا نے آخری مہلک حملہ کر دیا۔

"میں نے سنا ہے ـــــ شاید غلط ہو، لیکن مجھے کسی نے بتایا ہے کہ آپ لڑکوں میں بہت مقبول ہیں، بہ نسبت لڑکیوں کے۔ کہیں آپ وہ ـــــ تو نہیں؟"[28]

کیڈٹ عثمان اور علی جب ایک دوسرے کے قریب لیٹے ہوتے ہیں تو اس وقت علی کے نفس پر کیا گزرتی ہے، ملاحظہ کیجیے۔

"وہ وہاں گہری رات اور سنسان جنگل میں پیلے پھولوں والی جھاڑیوں کے نیچے قریب قریب ـــــ اتنے قریب لیٹے ہوئے تھے کہ ان کے جسم ایک دوسرے سے مس کر رہے تھے۔ ایک کی ہلکی سی لرزش بھی دوسرے کو محسوس ہو رہی تھی۔ وہ جب ایک دوسرے کی طرف دیکھتے تو چہروں کی قربت کے باعث ایک دوسرے کے سانس کی ہواڑ محسوس کرتے۔ یکدم علی کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ لمحہ نہ لمحہ اس کی دھڑکن میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا، جیسے کوئی سرکس میں موٹر سائیکل پر سوار آنکھوں پر پٹی باندھے موت کے کنوئیں کی ڈھلانوں پر چکر لگا رہا ہو۔"[29]

علی کیڈٹ عثمان کے لیے کشش محسوس کرتا ہے مگر وہ اس سے چھٹکارا پانے کی ہر ممکن کوشش کرتا ہے وہ نہیں چاہتا کہ کیڈٹ عثمان پر اس کی چھپی ہوئی کیفیت کا راز کھلے۔

"علی شاخ پہ بیٹھے پرند کی طرح پھڑ پھڑایا۔ اب اس میں مزید برداشت کی سکت نہ تھی۔ اس نے جست لگائی اور سرپٹ دوڑنا شروع کر دیا۔ اُسے محسوس ہوا کہ عثمان کے دہکتے جسم کا مقناطیس اسے اپنی طرف کھینچ رہا ہے ـــــ اور وہ کشش کے حصار کو توڑ کر باہر نکلنا چاہتا تھا۔ اس نے رائفل کو دونوں ہاتھوں سے مضبوطی سے تھام کر اندھا دھند بھاگنا شروع کر دیا ـــــ دشمن کے علاقے کی طرف۔"

ناول "غبار" میں عطیہ سید نے علی، حسین ان کی ماں اور باپ کے تعلقات کو شعوری طور پر بیان کیا ہے۔ اس ناول میں علی کے ساتھ ساتھ حسین کی بھی نفسیاتی کشمکش کو بیان کیا گیا ہے، حسین علی کا بڑا بھائی ہے۔ علی کے بعد اگر کسی کو باپ کے چلے جانے کا غم ہے تو وہ حسین ہے۔ باپ کے چھوڑ کر چلے جانے کے بعد علی سے

بھی زیادہ حسین کی زندگی مشکلات کا شکار ہوئی ہے۔ حسین کو اپنے باپ سے بہت محبت تھی۔ حسین کے بارے میں عطیہ سید لکھتی ہیں۔

> "علی کے مقابلے میں اس بے وفائی کا زیادہ صدمہ حسین بھائی ہی کو ہوا۔ وہ کہ ابا کی آنکھ کے تارے اور امی کے دلارے تھے۔ ان کی محبتوں سے سینچا، لاڈوں سے پالا پوسا وجود کس قدر نازک تھا۔ ان کی شخصیت کی عمارت جو علی کو مضبوط محسوس ہوتی تھی، کس قدر بودی نکلا۔ ہوا کے پہلے ہی تند و تیز ریلے کے سامنے کھڑی نہ ہو سکی اور ریزہ ریزہ ہو گئی۔ اس وقت حسین بھائی بی۔ ایس۔ سی کے طالب علم تھے۔ اس تعلیمی مرحلے میں ایسے اٹکے کی اب تک کنارے نہیں لگ سکے تھے۔ زمین ان کے پاؤں تلے سے سرک چکی تھی اور سر پر کوئی آسمان بھی نہ تھا۔"

حسین کی زندگی یکسر بدل کر رکھ دی۔۔ انھوں نے اپنی پڑھائی چھوڑ دی۔ جس وقت ان کا باپ انھیں اکیلا چھوڑ کر چلا گیا اس وقت حسین بی ایس سی کر رہا تھا۔ مگر باپ کے جانے کے دکھ کی وجہ سے وہ اپنی پڑھائی جاری نہ رکھ سکا۔ اور تنہائی کی زندگی کو اپنا مقدر بنالیا۔

> "علی کے مقابلے میں اس بے وفائی کا زیادہ صدمہ حسین بھائی ہو کو ہوا۔ وہ کہ ابا کی آنکھ کے تارے اور امی کے دلارے تھے۔ ان کی محبتوں سے سینچا، لاڈوں سے پالا وجود کس قدر نازک تھا۔ ان کی شخصیت کی عمارت جو علی کو مضبوط محسوس ہوتی تھی، کس قدر بودی نکلا۔ ہوا کے پہلے ہی تند و تیز ریلے کے سامنے کھڑی نہ ہو سکی اور ریزہ ریزہ ہو گئی۔ اس وقت حسین بھائی بی۔ ایس۔ سی کے طالب علم تھے۔ اس تعلیمی مرحلے میں ایسے اٹکے کہ اب تک کنارے نہیں لگ سکے تھے۔ زمین ان کے پاؤں تلے سے سرک چکی تھی اور سر پر کوئی آسمان بھی نہ تھا۔"

حسین کی زندگی کچھ لمحات کے لیے ایک خوبصورت موڑ لیتی ہے۔ جس میں حسین زندگی میں لوگوں میں دلچسپی لینے لگتا ہے۔ اس تبدیلی کی وجہ تسنیم تھی۔ جس کی محبت کی وجہ سے حسین میں مثبت تبدیلی آئی۔ مگر

یہ تبدیلی بھی وقتی تھی۔ حسین کی بے وفائی کی وجہ سے تسنیم نے حسین سے سارے تعلق اور رشتے ختم کر لیے۔ محبت میں ناکامی کے بعد حسین اپنی پرانی تنہائی اور مایوسی والی زندگی میں واپس آجاتا ہے۔ یہ ایک پاکستانی گھریلو کہانی ہے۔اس ناول کا پس منظر لاہور شہر ہے۔لاہور شہر کے مختلف مقامات کا ذکر عام ملتا ہے۔ مثلاً

"۔۔۔۔وہ کبھی "سالٹ اینڈ پیپر" جا کر گاڑی میں بیٹھے بیٹھے کافی پیتے، کبھی لبرٹی مارکیٹ میں آوارہ گردی ہوتی اور کبھی ریس کورس پارک میں رات گئے تک چہل قدمی۔"

علی خوب صورتی سے مالا مال تھا۔اس ناول میں گھریلو پریشانیوں، کرداروں کی نفسیاتی کشمکش اور جنسی تشنگی کا برملا اظہار ملتا ہے۔اس ناول کے کرداروں میں علی، حسین اور مس ڈینیل کا کردار نمایاں ہو کر سامنے آیا ہے۔ان کے مکالمے بھی سب سے زیادہ ہیں۔ علی کے کردار کا مطالعہ کیا جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ علی آغاز میں نرگسیت کا شکار نہیں تھا اور نہ ہی اس میں نسوانیت پائی جاتی۔ مگر وقت کے حالات کے پیشِ نظر اس میں یہ تبدیلی رونما ہوئی۔ وہ باپ کے چلے جانے کے بعد نفسیاتی طور پر خوفزدگی کا شکار ہے۔یہی خوف اس کے حال کو متاثر کرتا ہے۔ نتیجتاً وہ باہر کے خوف اور شکست سے فرار حاصل کر کے اپنے آپ میں گم ہو کر نسوانیت میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ علی احساس کمتری کا شکار بھی دکھائی دیتا ہے۔ وہ مختلف ذریعوں سے اس احساس کا تدارک کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

علی ایک طرف کیڈٹ عدنان کے لیے کشش محسوس کرتا ہے تو دوسری طرف اس سے دور بھاگنے کی بھی کوشش کرتا ہے۔ یہ متضاد روّیہ علی کی شخصیت کو کچل کر رکھ دیتا ہے۔اور اس کے ذہنی وجذباتی ہیجان میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ علی جب پہلی بار نرگھس کے گھر آتا ہے تو معمول کی باتیں ہوتی ہیں۔ مگر دوسری ملاقات میں وہ خود اپنی مرضی سے اس کے گھر آتا ہے تو پچھتاتا ہے کہ اسے یہاں نہیں آنا چاہیئے تھا۔ دوسری طرف نرگھس اسے محبت کا علامیہ سمجھ کر علی کے قریب آنا چاہتی ہے۔وہ خود سپردگی کے نشے سے مخمور دکھائی دیتی ہے

مگر علی گھبراہٹ کا شکار دکھائی دیتا ہے۔ وہ نرگس کا جھکاؤ دیکھ کر بھاگ کھڑا ہوتا ہے۔ نرگس علی کے ردّ عمل پر حیرت اور غصّہ کی حالت میں تڑپتی گھلتی وہیں کھڑی رہتی ہے۔

"نرگس نے اپنے ہونٹ اس کے ہونٹوں پر رکھ دیے۔ علی کو یوں محسوس ہوا جیسے وہ کسی لجلجے پلاسٹک کا بوسہ لے رہا ہے۔ نرگس کے بوسے میں تختی صاف کرنے والی گاچنی کا ذائقہ تھا۔ وہ تڑپ کر نرگس کی آغوش سے نکلا اور اُٹھ کھڑا ہوا۔ نرگس کی آنکھوں میں پہلے حیرت نمودار ہوئی ـــــ پھر غصّہ، لیکن علی اس کے ردِ عمل سے مکمل طور پر بے خبر معلوم ہوتا تھا۔ وہ وہاں سے بھاگ جانا چاہتا تھا ـــــ فوراً۔ اس کی نگاہوں کے سامنے دھند تنی تھی اور اس کے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہو گئے تھے۔ وہ اندھا دھند دروازے کی طرف لپکا اور نرگس کے فلیٹ سے باہر نکل گیا۔"[30]

علی کے ذہن میں مختلف سوالات جنم لیتے ہیں، جو اس کے ذہنی الجھن کا باعث بنتے ہیں۔ ساتھ ہی علی کے خواب میں نجا کے پیچ و داؤ بھی جاری رہتے ہیں۔ آخر کار علی اپنی ذات کی تمام خامیوں کو قبول کر لیتا ہے۔ اور وہ یہ بھی مان لیتا ہے کہ وہ ایک سمگلر کا بیٹا ہے۔ مس ڈینیل کو وہ سب بتا دیتا ہے۔ مس ڈینیل کو وہ یہ سب بتا کر خود اعتماد دکھائی دیتا ہے۔ اپنی سوچوں سے ماضی کا غبار اتا پھینکتا ہے اور جمی کی قربت حاصل کر لیتا ہے۔

تہذیبی تصادم اور اضطراب

یہ ناول خالص مشرقی تہذیب کا پروردہ ہے۔ یہ ایک پاکستانی گھریلو کہانی ہے۔ مشرقی کے زیرِ اثر یہ ناول لکھا گیا ہے۔ اس ناول میں عطیہ سید نے علی کے کردار کا مطالعہ مشرقی تہذیب کو بنیاد بنا کر کیا ہے۔ نسوانیت اور نرگسیت کے شکار مرد دوسری تہذیبوں میں بھی پائے جاتے ہیں۔ مگر غیر ممالک میں اس چیز کو نفرت یا حقارت کی نظر سے نہیں دکھا جاتا۔ بلکہ نسوانیت اور نرگسیت کے شکار مرد دوسروں کی توجہ اور دلچسپی کی وجہ بنتے ہیں۔ ہم جنس پرستی بھی اسی صورت میں پیدا ہوتی ہیں غیر ممالک میں لوگ مخالف جنس کی بجائے ہم جنسوں کی طرف زیادہ راغب ہوتے ہیں۔

عطیہ سید نے اس ناول میں دو تہذیبوں کا فرق واضح کیا ہے۔ کہ مشرقی ممالک میں اگر کسی مرد میں نسوانیت یا نرگسیت پائی جاتی ہے تو اسے کن کن مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ دوسروں کے طنز و مزاح کا نشانہ بن بن کر خود اس مرد کی اپنی ذات اور تشخص کہیں کھو کر رہ جاتا ہے۔ ایسا شخص کئی نفسیاتی الجھنوں کا شکار ہو جاتا ہے۔ وہ معاشرے میں سر اُٹھا کر نہیں جی سکتا۔

فلسفہ قومیت

ہر انسان کے لیے ضروری ہے کہ وہ ہر چیز کے بارے میں اپنا ایک واضح نکتہ نظر رکھے۔ ہر انسان کے اندر انسان کی ذات اور حیات و کائنات کے بارے میں ایک تصور موجود ہوتا ہے مگر وہ اس کو ترتیب اور باقاعدہ شکل نہیں دیتا۔ فرد کا اپنی سوچ اور تصور کو مربوط کرنا نہ صرف اپنی ذات کے لیے بلکہ معاشرے کے لیے بھی بہت ضروری ہے۔ عطیہ سید اس حوالے سے کہتی ہیں۔

> "۔۔۔ فرد اگر اپنی سوچ کو باقاعدہ ترتیب نہیں دیتا تو اس کی زندگی خلفشار کا شکار ہو جاتی ہے۔ اور اگر معاشرہ اپنی سوچ کو باقاعدہ نہیں بناتا تو اس میں افراتفری، انتشار اور امن عامہ میں لاء اینڈ آرڈر جیسے بڑے بڑے بحران جنم لیتے ہیں۔"[31]

سرمایہ داری اور اخلاقی تنزل

عہدِ جدید کی زندگی نے وہ سماجی مسائل پیدا کیے ہیں جس نے فرد کی داخلی دنیا میں انتشار پیدا کر دیا ہے۔ اس دور میں جتنی تیزی سے صنعتی اور مادی ترقی ہوئی وہیں اس مقصد کے حصول کے لیے عیاری، مکاری اور دھوکہ دہی جائز عمل قرار دیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی سرمایہ دارنہ نظام نے فرد کی ذاتی اور سماجی زندگی کو یکسر بدل کر رکھ دیا۔

سرمایہ دارانہ نظام کی بدولت بہت سے غیر اخلاقی فعل بھی سرزد ہوتے ہیں۔ اس طرح کے نظام میں لوگ ذاتی دشمنی کے سبب دوسروں فریق کی بہن اور بیٹیوں کی عزت سے کھیلتے ہیں۔ ظالم اور امیر طبقہ زمینوں کے حصول کے چکر میں غریبوں کی بیٹیوں کی عزت کا سودا کرتے ہیں۔ دولت اور زمینوں کا حصول کی لڑائی میں

معصوم لڑکیاں اپنی عزت سے ہاتھ دھو بیٹھتی ہیں۔ جن سے ناجائز اولادیں پیدا ہوتی ہیں۔ ایسی مائیں اپنی ناجائز اولادوں کو کسی کے گھر کے آگے یا کسی کوڑے کے ڈھیر پر پھینک جاتی ہیں۔ ایسے کئی لاوارث بچے ملتے ہیں جن کی معاشرے میں کوئی پہچان نہیں ہوتی۔ اس ناول میں زیشان ماموں کا شمار ایسے ہی لاورث اور ناجائز جنم لینے والے بچوں میں ہوتا ہے۔ جن کی اپنی کوئی پہچان نہیں۔ زیشان ماموں اپنی حیثیت کا اندازہ ہے۔ اسی لیے انھیں دنیا کی رنگینی میں کوئی دلچسپی نہیں۔ وہ خاموش طبیعت کے مالک انسان بن گئے ہیں۔ علی کی نانی کا کوئی بیٹا نہیں تھا انھوں نے زیشان ماموں کو گود لیا تھا۔ تاکہ ان کے گھر میں خوشیاں آسکیں۔ مگر نانی کی دونوں بیٹیوں سے ملنے والے دکھوں نے نانی کو قنوطی بنا دیا تھا۔ نانی کی ایک بیٹی کو طلاق ہو گئی تھی اور دوسری بیٹی یعنی علی کی امی کو شوہر انھیں چھوڑ کر چلا گیا۔ یہ دکھ نانی کو اندر ہی اندر سے کھارہا تھا۔ اپنے دکھوں کی داستان وہ زیشان ماموں کو سناتی رہتی تھیں۔ زیشان ماموں جو کہ پہلے ہی زندگی سے آوازار تھے مزید اس دنیا سے ان کا اعتبار اُٹھ گیا۔ اور پریشانیوں سے انھیں دماغی دورے پڑنے لگے۔ نتیجتاً انھیں دماغی امراض کے ہسپتال میں منتقل کرنا پڑا۔

اس ناول میں علی کے باپ کا کردار ایک سمگلر کے طور پر سامنے آیا ہے۔ علی کا باپ پیسہ کمانے کے چکر میں ملک سے باہر چلا جاتا ہے اور وہاں وہ ایک پاکستانی لڑکی سے شادی کر لیتا ہے۔ وہ لڑکی بھی سمگلنگ کے کام میں اس کے باپ کے ساتھ برابر کی شریک ہوتی ہے۔ پیسوں کے حصول کے لے وہ پاکستان میں اپنی بیوی اور دو بچوں کا مستقبل داؤ پر لگا کر چلا جاتا ہے۔ دولت کا نشے میں اسے اس بات سے کوئی سروکار نہیں ہوتا کہ اس کے بعد اس کے گھر والوں کا کیا ہوگا۔ دولت کمانے سے اس کے اخلاق میں کوئی تبدیلی رونما نہیں ہوتی وہ پہلے سے زیادہ بد اخلاق واقع ہوتا ہے۔ اس نے علی کی ماں کی کبھی عزت نہیں کی علی کی ماں جو کہ ایک سیدھی سادھی مشرقی عورت تھی چپ چاپ سب برداشت کرتی تھی۔ آخر کار امریکہ کی پولیس اس کو سمگلر ہونے کے جرم میں پکڑ لیتی ہے۔ اس ناول سے یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ دولت کے حصول کے لیے انسان سارے رشتوں کا احترام بھلا دیتا ہے۔ اس کے نزدیک حقیقی رشتوں کی کوئی اہمیت نہیں رہتی۔ نتیجتاً اُس کے پاس جو کچھ ہوتا ہے وہ بھی کھو جاتا ہے۔ برے کام کا انجام برا ہی نکلتا ہے۔

اس ناول کا آغاز انسانی دکھ، درد اور اذیت سے ہوتا ہے جبکہ اختتام انسانی امید، حقیقت اور سچائی پر ہوتا ہے۔ مجموعی طور پر "غبار" ایک کامیاب ناول ہے۔ یہ ناول اپنی انفرادیت، انوکھے موضوع اور اپنے نفسیاتی حوالوں کی بناپر اُردو ناولوں میں ایک ممتاز حیثیت رکھتا ہے۔

حوالہ جات

[1]-غبار، ص124،123

[2]-غبار، ص127

[3]-غبار، ص92

[4]-"غبار، ص96

[5]-"غبار"ص96

[6]-اے بی اشرف، سلمیٰ بینلی، ڈاکٹر۔"عطیہ سید کی کہانیوں کا تجزیاتی مطالعہ"مشمولہ: مجلّہ سپوتنک (ماہنامہ)
جلد نمبر16، شمارہ نمبر 5۔لاہور: سپوتنک دی مال، 2005ء ص146

[7]-"غبار"ص36

[8]-"غبار"ص58

[9]-"غبار"ص132

[10]-"غبار"ص9

[11]-عطیہ سید، (فلیپ) غبار۔لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز۔2012ء

[12]-محمد اکرام چغتائی، تشریحی لغت، اُردو سائنس بورڈ لاہور، 2001ء ص557

[13]-"غبار"ص104،103

[14]-"غبار"ص104"

[15]-"غبار"ص139

[16]- "غبار" ص 56،57

[17]- "غبار" ص 54،55

[18]- "غبار" ص 119

[19]- "غبار" ص 119

[20]- "غبار" ص 7

[21]- "غبار" ص 142

[22]- "غبار" ص 134

[23]- "غبار" ص 134

[24]- "غبار" ص 135

[25]- "غبار" ص 45

[26]- "غبار" ص 8

[27]- "غبار" ص 142

[28]- "غبار" ص 51،52

[29]- "غبار" ص 39"

[30]- "غبار" ص 108

[31]- راجا نئیر، انٹرویو از عطیہ سید، 17 اکتوبر 2019ء

باب پنجم

عطیہ سید کے افسانوی مجموعوں کا نفسیاتی اور فلسفیانہ مطالعہ

عطیہ سید کے افسانوی مجموعوں کا نفسیاتی اور فلسفیانہ مطالعہ

عطیہ سید کا شمار اُردو ادب کی ایسی قد آور شخصیات میں ہوتا ہے۔ جن کے ادبی کارنامے ان کے گہرے مشاہدات و تجربات کا نچوڑ ہیں۔ عطیہ سید بہ یک وقت افسانہ نگار، مترجم، ناول نگار، دانش ور اور ماہرِ اقبالیات ہیں۔ انھوں نے اپنے افسانوں میں معاشرے کے اہم مسائل کو پُر اثر انداز میں پیش کیا۔ عطیہ سید وسیع القلب، وسیع الذہن اور وسیع النظر شخصیت کی حامل خاتون ہیں۔ ان کے افسانوں میں فہم کا تنوع، مشاہدے کی کثرت اور گہرائی کی شدت کا واضح عکس دکھائی دیتا ہے۔ انھوں نے اپنی فکری و فنی بصیرت سے کام لیتے ہوئے عہدِ جدید کے نت نئے مسائل کو کمال فنکاری سے اپنی اپنے افسانوں میں پیش کیا۔ انھیں فکری و فنی خصوصیات کے باعث عطیہ سید کو اپنے معاصر افسانہ نگاروں میں ممتاز و منفرد مقام حاصل ہے۔ ان کے افسانے خاص توجہ کے مستحق اور ادبی اہمیت کے حامل ہیں۔ عطیہ سیّد کے اس رجحان کے حوالے سے ڈاکٹر نورین رزاق لکھتی ہیں:

"عطیہ سیّد کے افسانے اپنے فلسفیانہ رجحانات کی وجہ سے معاصر افسانہ نگاروں سے الگ اور منفرد ذائقہ کے حامل ہیں۔ وہ انسانی نفسیات (Human Psychology) کی تہہ در تہہ پرتوں اور جہتوں کو پیش کرتی ہیں۔"[1]

عطیہ سید فلسفیانہ فکر رکھتی ہیں۔ وہ سمجھتی ہیں کہ ہر انسان پیدائشی طور پر فلسفی ہی ہوتا ہے۔ وہ اس حوالے سے کہتی ہیں۔

"ہم سب پیدائشی طور پر فلسفی ہیں۔ اس لیے کہ ہم سب کا تعلق چاہے کسی بھی پیشے سے ہو۔ ہم تعلیم یافتہ ہوں یا غیر تعلیم یافتہوں، چاہے رکشہ چلا رہے ہوں یا کسی ادارے کے CEO ہوں، زندگی کے باری میں انسان کے بارے میں، موت کے بارے میں کائنات کے بارے میں، کوئی نہ کوئی تصور ہمارے اندر موجود ہوتا ہے۔، صرف یہ تصور مربوط نہیں ہوتا، لیکن اس کو مربوط اور باقاعدہ بنانا لازمی ہے"[2]

اے بی اشرف عطیہ سید کی افسانہ نگاری کے حوالے سے کہتے ہیں۔

"عطیہ سید کہنے کا فن جانتی ہیں۔ فضا اور منظر کی تصویر کشی بہت خوبصورت انداز میں کرتی ہیں۔ زبان کو مہارت کے ساتھ استعمال کرتی ہیں۔ کہانی میں جملے دلکشی اور لطافت سے بھرپور ہوتے ہیں۔ مختصر کہانی میں لفظ اور جملے کی بڑی اہمیت ہیں اور عطیہ سید اس اہمیت سے واقف ہیں۔ کہانی پن عطیہ سید کے افسانوں کی خوبی ہے۔ وہ کہانی کا تانا بانا اس انداز میں بنتی ہیں کہ توجہ کہانی سے نہیں ہٹتی۔ ہم یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ قاری اس کو ختم کیے بغیر نہیں چھوڑ سکتا۔"[3]

نفسیاتی مطالعہ

استعارے اور علامات

وہ لفظ جو اپنے حقیقی معانی کے بجائے مجازی معنی دے اور کسی مصنف کے ہاں بار بار اپنی معنوی وسعت کے ساتھ استعمال ہو علامت کہلاتا ہے۔ ادب میں علامت سے مراد ایک ایسی پیشکش ہے جو ذہن کو کسی چیز یا خیال کی جانب منتقل کرتی ہو اور معنویت کی ایک ایسی سطح سامنے لائے جس کو عام الفاظ اپنی گرفت میں لینے سے قاصر ہوں۔ حمیرا اشفاق اِس حوالے سے لکھتی ہیں کہ "علامتی طرز نے افسانے کے اندر رمز و ایما کا حسن اور اختصار و ایجاد کا حسن پیدا کیا"۔[4]

عطیہ سید کے افسانوں میں نچلے اور متوسط طبقے کی مختلف روپ ملتے ہیں جو مفلسی کی حالت میں زندگی گزارتے ہیں۔ وہ غریب طبقے کی مفلوک الحالی کا بیان شدت سے کرتی ہیں۔ وہ اس صورتِ حال کو خوب صورت استعاراتی انداز میں پیش کرتی ہیں۔ انھوں نے اپنے افسانوں میں کمال مہارت سے استعاروں کو استعمال کیا ہے۔ استعاروں کے پیرائے میں وہ اپنی بات کو نئے اور انوکھے انداز میں پیش کرتی ہیں۔ عطیہ سید نے اپنے افسانوں میں نیلا رنگ موت کی علامت کے طور پر استعمال کیا ہے، افسانہ "آنسو کا نمک" کا آغاز بھی نیلے رنگ سے ہوتا ہے۔

"کار تار کول کی نیلی ہموار دھوپ کی تمازت سے جگمگاتی سڑک پر تیزی سے بھاگتی جا رہی تھی۔ سڑک کے دونوں کناروں پر لگے درختوں کی چھتریاں خوبصورتی سے کھلی ہوئی

تھیں۔ ان کے پیچھے ہریالی کی خنک طراوت کھیت در کھیت، میدان در میدان کوہساروں تک پھیلی ہوئی تھی۔ موسمِ بہار کی تازہ بارش کے چھینٹوں سے مٹی کی سوندھی مہک آرہی تھی۔"[5]

افسانہ "واپسی" میں بھی نیلے رنگ کا استعارہ استعمال کیا گیا ہے۔

"ٹیکسی نیلی تار کول سے چمکتی سڑکوں پر پانی پر تیرتی کشتی کی طرح رواں ہے اور مضافات سے ہوتی ہوئی نئی اعلیٰ قسم کی آبادیوں سے گزر رہی ہے۔ آخر کار وہ شہر کے دل میں جا کر رکی جہاں کا میں کبھی باسی تھا۔۔۔۔یا شاید اب بھی ہوں۔"[6]

افسانہ "شہر ہول" میں عاصمہ جب مارکیٹ کے پاس پڑے گتے کے ڈبے کو دیکھتی ہے تو اس کی نظر مسز فان کریمر پر پڑتی ہے اس منظر کو عطیہ سید نے اس طرح بیان کیا ہے:

"۔۔۔۔گتے کا ایک بڑا ڈبہ اوندھا پڑا تھا اور اس کا منہ کھلا ہوا تھا۔ پھر اسے ایک سوکھی ہڈیوں، میلے ناخنوں والا ہاتھ نظر آیا جو ڈبے سے باہر لٹک رہا تھا، اس کا دل زور سے دھڑکا۔ وہ زمین پر بیٹھ گئی اور جھک کر ڈبے کے اندر جھانکا۔ ڈبے کے اندر جھانکنے سے اس کے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ اندر ایک بوڑھی سکڑی ہوئی ممی تھی جو منوں برف کی تہہ میں دب کر منجمد ہو چکی تھی۔ اس کا رنگ زہریلا نیلا تھا اور آنکھیں کھلی ہوئی تھی۔ اس نے پہچان لیا یہ مسز فان کریمر تھی۔"[7]

مسز کریمر کا رنگ زہریلا نیلا ہونا اس کی موت کو ظاہر کرتا ہے۔ افسانہ "دو چڑیاں" سے اقتباس:

"ان میں سے ایک جوانی میں ہی نیلی ہو کر مٹی تلے جا سوئی۔۔۔وہ سحرش تھی۔"[8]

افسانہ "نوحہ" سے اقتباس:

"عافیت صرف چند لمحے شکستہ کمرے میں نیلی لاش کے سہارے کھڑی رہی"[9]

افسانہ "طلسمِ دل رُبا" کا ایک پیرا گراف:

"ہوائیں تند اور یخ تھیں۔ لڑکی کا بدن نیلا پڑنے لگا"

"وہ رات شادماں تھی، لیکن صبح بے مہر اور دن ناکام۔ دن کی روشنی میں پیلی کی سوچ میں ایسے کنڈل پڑے۔۔۔۔ ایسے گنجل پڑے کہ پچھتاوے کے سانپ نے اسے ڈس ڈس کے نیلا کر دیا۔"[10]

افسانہ "دہلیز" کی قلم کاری:

"جمیل۔۔۔ کا ذہن خواب آور دوائیوں کے باوجود بیدار تھا۔ جسم اکڑا ہوا تھا۔ پاؤں اور ہاتھوں کی رگیں اُبھری ہوئیں اور ناخن نیلے تھے۔"[11]

افسانہ "بیلاروما" سے اقتباس:

"درختوں، نیلی سڑکوں اور تاریخ کے کئی موڑوں سے گزرتی ہوئی بس روم میں داخل ہوئی اور ٹرمینل کی عمارت کے سامنے رک گئی۔"[12]

بقول ڈاکٹر اے بی اشرف:

"بعض کہانیوں میں زندگی کی تلخ حقیقتیں بیان ہوئی ہیں لیکن اِن حقیقتوں کی تلخی اور چبھن کو اسلوب بیان نے دلکش اور منصفہ کے زاویہ نگاہ نے دلچسپ بنادیا ہے"۔[13]

جنسی نفسیات

عطیہ سید کے ہاں عورت کے ان مسائل کا اظہار ہوا ہے جن سے آج کی عورت گزر رہی ہے۔ ان کی فکشن میں جنس کی نفسیات کا استعمال فنی تقاضوں کے مطابق کیا گیا ہے۔ افسانہ کرسمس کی شب، بلقیان کا بت، سبز اندھیرا اور عکس اس کا واضح ثبوت فراہم کرتے ہیں۔

عطیہ سید کے ہاں جنسی موضوعات کا ذکر حال حال ہی دکھائی دیتا ہے مگر چند ایک جگہ انھوں نے فنی تقاضوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے مرد اور عورت کی جنسی نفسیات کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے۔ مثلاً افسانہ "بلقیان کا بت" میں کردار احمد شاہ جس نے ماں باپ کی محبت کے علاوہ کسی انسان کو نہ دیکھا نہ اس کی محبت ملی وہ

کوئی دوست یا ساتھی تلاش کرنے کی غرض سے گھر سے باہر نکلتا تاکہ کوئی تو ایسا ہو جس سے وہ باتیں کر سکے اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر سکے ایک دن اس کو ایک پہاڑ کے پیچھے ایک بہت بڑا بت دکھائی دیتا ہے جو احمد شاہ کو بہت اچھا لگا احمد شاہ اس سے بہت محبت کرنے لگا۔

"۔۔اکثر احمد شاہ۔۔۔۔بت کے سامنے بیٹھ جاتا اور پہروں اسے تکتا رہتا۔ کبھی کبھار وہ اس کے قدموں میں بیٹھ جاتا۔ پھر جرات کر کے اس کے پاؤں چھوتا اور پاؤں میں نفیس انگلیوں پر ہاتھ پھیرتا۔ ان کی ٹھنڈک اس کے وجود میں مسکراہٹ کی طرح پھیل جاتی۔ آہستہ آہستہ وہ اور بے تکلف ہو گیا اور بت کے ملبوس کو چھونے لگا۔۔۔ مگر ڈرتے ڈرتے وہ بت کے چہرے کو بھی دیکھتا جاتا کہ کہیں وہ ناراض تو نہیں ہو رہا۔ اسے لگتا کہ وہ زندہ ہے۔ لیکن بُت اس کی تمام بے تکلفیوں اور محبت بھری گستاخیوں کے باوجود مسکراتا رہتا۔ احمد شاہ کا دل چاہتا کہ وہ اسے گلے لگالے۔ اس کی گردن میں بانہیں حمائل کر دے، لیکن وہ تو اس قدر بلند تھا اور احمد اتنا ہی چھوٹا۔ اس کے باوجود اسے اس خواہش نے بے قرار رکھا اور وہ دھیرے دھیرے اس کی ٹانگوں سے لپٹنے لگا جس سے اسے عجیب سی طمانیت حاصل ہوتی۔۔۔۔ اور بت مسکراتا رہتا۔ اس کی ہلکی سی مسکراہٹ لبوں کے کناروں سے نکل کر اس کے چہرے پر پھیل گئی۔"[14]

ان افسانوں میں عطیہ سید ایک حقیقت نگار کی صورت میں ہمارے سامنے آئی۔ انھوں نے جنس کی نفسیات کے استعمال کے ذریعے معاشرے مخفی رازوں کو بے نقاب کیا ہے۔ عطیہ سید کے افسانوں میں عورت کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ کہیں یہ عورت قوت اور طاقت کے روپ میں سامنے آئی ہے تو کہیں یہ بے بسی، محرومی اور بے چارگی کی تصویر دکھائی دیتی ہے۔

شعور، لاشعور، تحت الشعور اور شعور کی رو

انسان بظاہر سادہ اور سلجھا ہوا نظر آتا ہے لیکن اس کا وجود شعور، لاشعور اور تحت الشعور کا مجموعہ ہے اور یہ فنکار کے گہرے مشاہدے اور نفسیاتی بصیرت پر منحصر ہے کہ وہ انسان کی ان کیفیات کا کس حد تک کھوج لگاتا

ہے۔ عطیہ سید انسان کی ان کیفیات کا ادراک کرنے میں نہ صرف طاق ہیں بلکہ وہ اپنے عمیق مشاہدے اور مستقل مزاجی سے ان کیفیات کی بے لاگ عکّاسی کر کے منظرِ عام پر لاتی ہیں۔ عطیہ سید کی کہانیاں خاص مغربی ہونے کے باوجود مشرقی آویزش کا اثر لیے ہوئے ہیں۔ خود کلامی، شعور کی رو، تحت الشعور اور فلیش بیک کی تکنیک کے تحت طرز جدید کے افسانے لکھے گئے۔ ان کا ہاں تکنیک کا تنوع نظر آتا ہے۔

> " جب بھی کوئی کہانی ذہن میں پک رہی ہوتی ہے تو وہ اپنی تکنیک خود طے کرتی ہے۔ تحریر بذاتِ خود تکنیک کا فیصلہ کر رہی ہوتی ہے۔ میں کہانی کو Follow کرتی ہوں۔ "[15]

عطیہ سید کے زیادہ تر افسانے بیانیہ انداز میں لکھے گئے ہیں۔ ڈاکٹر مرزا حامد بیگ عطیہ سیّد کے بیانیہ انداز کے بارے میں کہتے ہیں کہ عطیہ سیّد کے افسانے بیانیہ لیکن حد درجہ جاذب توجہ نثر کا نمونہ ہیں۔[16] فلیش بیک کی تکنیک کے ذریعے عطیہ سید ماضی سے حال تک کا خوب صورت سفر کرتی ہیں۔ اس تکنیک کے تحت لکھے گئے افسانوں کی مثالیں دیکھیے۔

> " سنبل ایک مرتبہ پہلے بھی تو یہاں آئی تھی ـــــ اور اسے خیال کی کہر میں دکھائی دیا۔ مدھم مدھم۔ وہ اور فروا اور لا بور گیزے میں داخل ہوئیں۔ ان کے وجود سے ہستی کا بھر پور پن پھوٹ رہا تھا۔ فرحاں اور شاداں ـــــ وہ ہوا کے دوش پر دو گہرے چمکیلے پروں والی تتلیوں کی طرح لہرا رہی تھیں۔
>
> " بائے بائرن ـــــ میرا محبوب شاعر ـــــ فوراً میری تصویر بناؤ ـــــ لارڈ بائرن کے ساتھ ـــــ سنبل نے کہا۔ "[17]

افسانہ " مٹھی میں بند لمحہ " میں بھی فلیش بیک کی تکنیک استعمال کی گئی ہے۔ خود کلامی کے حوالے سے افسانہ "ہوٹل سلازار" اس کی بہترین مثال ہے جس میں کہانی نگار خیالی نسوائی کردار لنڈا سے باتیں کرتا ہے۔

عطیہ سید کے افسانوں پر فرائڈ،اڈلر اور یونگ کے اثرات نمایاں ہیں۔ شعور، لاشعور اور تحت الشعور کے تحت بیشتر افسانے لکھے گئے۔ان کے ہاں عہدِ جدید اور اس کے پیچیدہ مسائل کے نمونے جا بجا ملتے ہیں۔ عطیہ سید کے افسانوں میں شعور کے علاوہ شعور کی رو بھی کرداروں کے اعمال افعال اور گفتگو کو صورت میں دکھائی دیتی ہے شعور اور شعور کی رو انسانی زندگی کے ہر عمل پر اثر انداز ہوتا ہے۔ علمِ نفسیات کے مطابق شعور کی رو کا عمل بچپن سے موت تک جاری رہنے کا نام ہے۔اس کی حیثیت برقی رو یا کرنٹ کی سی ہے جو بغیر رکاوٹ کے مسلسل جاری رہتا ہے۔ شعور کی رو میں ماضی، حال اور مستقبل میں ذہن میں اٹھنے والے بے ترتیب خیالات اور تاثرات کا احاطہ کیا جاتا ہے۔ شعور کی رو کے ذریعے ادیب زمان و مکاں کی پابندیوں سے آزاد ہو جاتا ہے۔ عطیہ سید کے ان افسانوں میں شعور کی رو کے استعمال سے فن کی رنگارنگی اور تنوع کی کیفیت بیدار ہوتی ہے۔

نفسیاتی الجھنیں

عطیہ سید نے خارجی دنیا کے ساتھ ساتھ کرداروں کی داخلی دنیا کا سراغ بھی لگایا ہے۔اس سلسلے میں انھوں نے کرداروں کی کئی نفسیاتی بیماریوں کا برملا اظہار بھی کیا ہے۔ان کے افسانوں میں ذہنی دباؤ، ناسٹلجیا، ہیل زائمر، فوبیا، ہسٹریا، احساسِ کمتری، احساسِ برتری اور ڈپریشن جیسی بہت سی بیماریوں کا ذکر اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ انھیں نفسیات نگاری پر مکمل گرفت حاصل ہے۔

افسانہ " ڈھلوان" میں کردار ملک صاحب ‘‘Helzeimer’’ بیماری کا شکار ہیں۔ ملک صاحب وکالت کے پیشے سے وابستہ ہیں۔انھیں قانونی نکات بھولنے لگے۔ گھر میں لاکر کی چابی، جگہوں کے نام، ملنے والوں کے چہرے، راستے سب نقوش مٹنے لگے۔ ملک صاحب نے ڈاکٹر ہیل زائمر سے دوا منگوائی مگر کوئی آفاقہ نہ ہوا۔ ملک صاحب کی بھتیجی افشین انھیں مشورہ دیتی ہے کہ وہ دوائیاں استعمال کرنے کی بجائے نماز پڑھا کریں۔ افشین کی یہ بات انھیں تیر کی طرح لگتی ہے کہ کیا اس کی بھتیجی اس کو اتنا لامذہب سا آدمی سمجھتی ہے؟ اگلے دن فجر کی اذان سنتے ہی وہ خدا کے حضور سجدہ ریز ہو جاتا ہے۔انھیں یوں محسوس ہوتا ہے کی وہ ڈھلوان سے تیزی سے نیچے کی طرف جا رہے ہیں۔ یہی وقتِ قبولیت ہے۔ ان کی ساری پریشانیاں، دکھ ،درد ، غم اور غصّہ ختم ہو

جاتے ہیں۔انھیں سکون وراحت آگھیر تے ہیں۔اسی طرح افسانہ "شہرِ ہول" میں ڈی ڈی کولٹ احساسِ برتری کا شاخسانہ ہے۔ اس کی بے پناہ دولت و شہرت اسے اس بات کی اجازت نہیں دیتی کہ وہ کسی سے ملے۔ وہ سب لوگوں سے دور اپنے آپ کو ایک الگ کمرے میں بند رکھتا ہے۔ اسی تنہائی میں وہ ایک دن مر جاتا ہے۔ اسے مرے ہوئے کئی دن گزر جاتے ہیں مگر کسی کو خبر تک نہیں ہوتی۔

اسی افسانے میں ایک کردار فیشن ایبل ماڈل خاتون کا ہے جو اب بوڑھی ہونے کی وجہ سے احساسِ کمتری میں مبتلا ہے۔ وہ اپنی مارکیٹ ویلیو بڑھانے کے لیے پلاسٹک سرجری کروالیتی ہے تاکہ وہ جوان اور حسین نظر آئے۔ مگر ان سب کے باوجود وہ جس فرم میں کام کرتی ہے وہاں سے اسے اس کی عمر زیادہ ہونے کی وجہ سے نکال دیا جاتا ہے۔ یہ فیشن ایبل ماڈل خاتون گاڑی میں بیٹھی اس افسانے کی ایک اور کردار عاصمہ سے اپنی عمر اور خوبصورتی سے متعلق مختلف سوالات کرتی ہیں تاکہ اس کی انا کو تسکین ہو سکیں کہ وہ اب بھی کم عمر اور خوبصورت دکھائی دیتی ہیں۔ مگر ان سب کے باوجود اس فیشن ایبل ماڈل خاتون کے اندر احساس کمتری ہے جو کہ اس کے لہجے اور بے ہنگم ہنسی سے صاف جھلکتا دکھائی دیتا ہے۔

افسانہ "ہوٹل سلازار" کا کردار بہزاد ناستیلجیا میں مبتلا ہے۔ بہزاد نوکری کی تلاش میں اپنا ملک چھوڑ کر امریکہ آبستا ہے۔ آغاز میں بہزاد کی جیب بھاری ہوتی ہے لیکن گزرتے وقت کے ساتھ اسے مالی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ وہ کم کرائے والے ہوٹل کے کمرے میں رہنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ امریکہ کے حالات وواقعات اور کچھ اپنی مالی حالت اسے اپنے وطن کی یاد دلاتی ہے۔ بہزاد جب جب اپنے ملک کو یاد کرتا ہے وہ ناستلجیا کی زد میں آتا چلا جاتا ہے۔اس کے اعصاب مغلوب ہوتے جاتے ہیں۔ وہ نیم غنودگی کی حالت میں رہتا ہے۔ ایک دن وہ ہوٹل کی لفٹ سے اوپری منزل کی طرف جانے کے لیے لفٹ میں داخل ہوتا ہے تو لفٹ نامعلوم منزل کی طرف خود بخود چلتی جاتی ہے اور پھر ایک دم جھٹکے سے رک جاتی ہے۔ بہزاد کو محسوس ہوتا ہے کہ کوئی بدبودار وجود اس سے لپٹا ہوا ہے۔ غور کرنے سے اسے پتا چلتا ہے کہ یہ وہی سفید فام نشئی ہے جو کہ اکثر اس عمارت کے قریب منڈلاتا رہتا تھا۔ بہزاد کچھ دیر اس سفید فام نشئی سے الگ ہونے کی کوشش کرتا ہے مگر ناکام رہتا ہے۔ اسی اثناء

میں اس سفید فام نشئی کی موت واقع ہو جاتی ہے۔ لفٹ سے باہر منیجر بہزاد کو بتاتا ہے کہ لفٹ خراب ہو گئی ہے۔ تھوڑی دیر میں اس کو ٹھیک کر دیا جائے گا۔ اسی عالم میں بہزاد سوچنے لگتا ہے کہ وہ اس شہرِ غدار میں کیا کر رہا ہے جہاں کسی کو اس بات کی پرواہ نہیں کہ وہ اس وقت کس حالت میں ہے۔ بہزاد فیصلہ کر لیتا ہے کہ وہ اس شہر سے چلا جائے گا۔

افسانہ "ہوٹل سلازار" کا ایک کردار "کہانی نگار" بھی ہے جو ایک خیالی نسوانی کردار لنڈا سے باتیں کرتا ہے۔ لنڈا غالباً کہانی نگار کی محبوبہ یا بیوی ہو گی جو یا تو کہانی نگار چھوڑ کر چلی گئی یا اس کی موت واقع ہو گئی۔ بہر حال لنڈا اب کہانی نگار کے ساتھ نہیں رہتی، جس کی یاد اس کے لاشعور میں ہر وقت رہتی ہے۔ وہ خیالوں میں لنڈا سے باتیں کر کے اپنی جنسی تسکین کرتا ہے کہ لنڈا اب بھی اس کے پاس ہے۔

افسانہ "میری میرا" میں نسوانی کردار "میری" کو بچپن سے اپنے والدین کا پیار نہین ملتا۔ وہ یہی پیار دوسروں میں تلاش کرتی ہے۔ یکے بعد دیگرے کئی مرد اس کی زندگی میں آتے ہیں۔ اس کے باوجود اس کو کہیں سکون نہیں ملتا۔ وہ ان سب سے اکتا جاتی ہے اور ڈپریشن کا شکار ہو جاتی ہے۔ وہ سکون حاصل کرنے کی خاطر منشیات کا ستعمال شروع کر دیتی ہے۔ اس کو وقتاً فوقتاً ڈپریشن کے دورے پڑتے رہتے ہیں۔

افسانہ "کر یکے اور چینی کمرہ" کا کردار کر یکے احساس برتری میں مبتلا نظر آتا ہے۔ کر یکے بچپن سے ہی "اے" (A) گریڈز لاتا رہا۔ اس نے پی ایچ ڈی کے لیے جو مقالہ (Thesis) پیش کیا اس کو بے حد سراہا گیا۔ وہ کئی کتابوں کا مصنف بھی وہ چکا ہے۔ بنیادی طور پر وہ ایک استاد ہے۔ اس کی کتاب "میں اگر چمگادڑ ہوتا" بہت مشہور ہوئی۔ وہ شہر کی بلند بالا عمارت میں رہتا ہے۔ جہاں اس نے ایک دور بین نصب کر رکھی ہے۔ جس کے زریعے وہ ستاروں کا مشاہدہ کرتا رہتا ہے۔ اسی دوران اس کا خیال "چینی کمرے" کی طرف گیا۔ اس ترقی کی وجہ سے کر یکے میں احساس برتری جنم لیتی ہے۔ اور وہ یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ اس جیسا قابل اور ذہین آدمی کوئی نہیں جو اس کا مقابلہ کر سکے۔

باطن نگاری

عطیہ سید ماہر نفسیات کی طرح کرداروں کے خیالات، تصورات، محسوسات، محرکات اور تخّیلات وغیرہ کو پیش کرتی ہیں۔ عطیہ سید کرداروں کے باطن میں اتر کر ان کے جذبات، فکر، تخیل، ذہنی الجھنیں، خواہشات، عزم، فیصلہ، حسرت اور پشیمانی وغیرہ کو سامنے لاتی ہیں۔ کسی بھی کردار کو ظاہری طور پر جاننا کافی نہیں ہوتا بلکہ اس کے باطن میں چھپے ہوئے انسان کا کھوج لگانا بھی ایک ادیب کا فرضِ اوّل ہے۔ اور عطیہ سید اس فن میں کمال مہارت رکھتی ہیں۔ وہ کرداروں کا ظاہری طور پر تعارف کروانے کے بعد اس کے باطن کی گہرائی میں اتر کر اس کی تمام تر نفسیاتی الجھنوں کا پردہ چاک کرتی ہیں۔ اس طرح ایک کردار کی مکمل تصویر ہمارے سامنے آجاتی ہے۔ عطیہ سید کے افسانے داخل اور خارج اور ذات و کائنات کے مختلف رنگوں کا امتزاج ہیں۔ ان کی کہانیاں احساسات و تاثرات کا خوبصورت مرقع ہیں۔ انھوں نے اپنے ارد گرد کی اصل اور حقیقی زندگی کو نظر انداز نہیں کیا بلکہ انسان کی داخلی بے چینیوں، بے قراریوں اور غموں کو اپنے پورے جذباتی انداز میں فنی حسن کے ساتھ پیش کیا۔

> "کسی شخص کے باطن کے پاتال کو چھونا کوئی آسان کام نہیں، کیونکہ صرف خود وہی شخص اپنے باطن تک رسائی رکھتا ہے۔۔۔۔ لیکن کیا وہ خود بھی اندر کے تمام اطراف کو پاٹ سکتا ہے، چاہے وہ کوئی عظیم مفکر یا ماہر نفسیات ہی کیوں نہ ہو۔"[18]

عطیہ سید اپنے کرداروں کی باطن تک رسائی کے لیے اور اندرونی کیفیات کی ترجمانی کے لیے تعارفی طریقہ اپناتی ہیں۔ زیادہ تر افسانوں میں افسانہ نگار ہی اپنی کرداروں کا تعارف کرواتا ہے۔ مثلاً

> "چھ بجے کی خبر "کا مرکزی کردار پچاس سالہ سسٹر ٹریزا ہے جس کے ہونٹ راہبانہ سرد مہری سے بھینچے ہوئے نہیں بلکہ ہر وقت مسکرانے کو تیار رہتے ہیں۔ وہ نادر حبشیوں اور مفلوک الحال تارکین وطن کے زخموں پر مرہم رکھنے کی ہر ممکن کوشش کرتی ہے۔ سسٹر ٹریزا سڑک کے جس فٹ پاتھ پر چل رہی تھی اِس پر چند قدم کے فاصلے پر جو اس

سال بچے لفنگوں کا ایک گروہ موجود ہے۔اِس مرحلے پر تین ثانوی کردار ظاہر ہوتے ہیں۔ ریڈ انڈین فرسٹ مون۔ دوسرا حبشی ٹام ہسلر اور تیسرا سلواڈور کا مہاجر ڈان کارلوس!اِن تینوں کرداروں کو عطیہ سیّد نے ایک ایک پیرایہ گراف میں متعارف کرایا ہے۔یہ تینوں کردار امریکن زندگی کے مرکزی دھارے سے الگ ہیں"۔[19]

خود کلامی بھی باطن نگاری کو ظاہر کرتی ہے۔خود کلامی کے انداز میں لکھے گئے افسانے بھی موجود ہیں جن میں کردار مسلسل سوچتے چلے جاتے ہیں اور اپنے لاشعور کے راز اگلتے جاتے ہیں۔مثلاً افسانہ "سبز اندھیرا"،"عکس"اور"دائرہ"وغیرہ۔

خارج نگاری،رمزیت،اشاریت اور عطیہ سید

عطیہ سید کی کہانیاں عام نفسیاتی حقیقت کو پیش کرنے کے ساتھ ساتھ انسان کی خارجی کیفیات کی بھی ترجمانی کرتی ہیں۔عطیہ سید داخلی کیفیات کے ساتھ ساتھ خارجی حسن اور رنگا رنگیوں کو کمال مہارت سے صفحہ قرطاس پر بکھیرتی ہیں وہ کہانی کے مناظر کے سہارے فطرت کے حسن کو بیان کرتی چلی جاتی ہیں مثلاً "یہ شاید خزاں کے دن تھے۔کھڑکی سے باہر لپٹی دھوپ میں عجیب بے بسی تھی۔صحن میں کھڑے گلچیں کا ایک پتہ ٹوٹ کر گرا، تواُس کے وجود میں ارتعاش سا پیدا ہوا۔کچھ دنوں سے اجنبی سی کیفیات ہیولوں کی طرح اس کے ساتھ تھیں جیسے اندھیرے کمرے میں لالٹین جلانے سے روشنی اور سایوں کا امتزاج جانے پہچانے کمرے اور اس میں رکھی روزمرہ کی مانوس اشیاء کی ہیئت و قامت میں پُراسرار اجنبیت پیدا کر دیتا ہے۔پتوں کا زرد ہو کر شاخوں سے گرنا،اس کے اندر ایک نا آشنا کسک پیدا کر دیتا تھا۔بہتے پانی اور بادلوں کے اڑتے ٹکڑے جو دیکھتے ہی دیکھتے برف گالوں کی صورت فضا میں تحلیل ہو جاتے،اس کے دل پر اداسی کی تحریر سی چھوڑ جاتے۔"

عطیہ سید کے کچھ افسانے سفر نامے کا عکس لیے ہوئے ہیں مثلاً افسانہ "ابھی نسترن کے پھول کھلے نہیں "اور افسانہ "دشت،بارش اور رات" عطیہ سید کی خارج نگاری کا بہترین ثبوت فراہم کرتے ہیں۔عطیہ سید نے مختلف ممالک کے سفر بھی کیے ہیں جن کے منظر ناموں کو کمال فنکاری سے بیان کیا ہے۔رمزیت اور اشاریت

بھی لاشعور کے نظریے کے تحت وجود میں آئی۔ جس میں تصورات ظاہری حقیقت سے دور ہوتے ہوئے بھی چیزوں کی اندرونی تہوں اور ان کی اصل فطرتوں کو ظاہر کرتے ہیں۔ سید عامر سہیل رقم طراز ہیں:

> "حسن کاری، سحر انگیزی، فکری ارتکاز اور فنی پختگی اِن کے افسانوں کے نمایاں اوصاف ہیں۔"[20]

عامر سہیل، عطیہ سیّد کے افسانوں میں پلاٹ کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> "ان کے ہاں پلاٹ کی سادگی کے باوجود کہانی پن کا مجموعی تاثر خاصا مضبوط رہتا ہے"۔[21]

عطیہ سید نے اپنے اکثر افسانوں میں رمزیت اور اشاریت سے کام لے کر بہت سے سوالوں سے پردہ اٹھایا ہے۔

فلسفیانہ مطالعہ

لفظ "فلسفہ" دو یونانی لفظوں "فیلو" اور "سوفیہ" سے مل کر بنا ہے۔ "فیلو" کے معنی ہیں "حُب" اور "سوفیہ" کے معنی "دانش" کے ہیں۔ یوں فلسفہ کے معنی "حُبِ دانش" کے ہیں۔ انسان کے چاروں طرف پھیلی دنیا کی کوئی حدود و انتہا نہیں ہے۔ جو لمحہ نہ لمحہ انسان کو غور و فکر کی دعوت دیتی ہے۔ انسان کلی طور پر اس کا ادراک نہیں کر سکتا۔ ارسطو کے مطابق سارے علوم کا وجود کسی نہ کسی فائدے کے لیے ہے، مگر فلسفہ کا وجود صرف اپنی ذات کے لیے ہے عطیہ سید نے فلسفے کے بارے میں اس طرح اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ عطیہ سید فکشن کی دنیا کا ایک ناگزیر نام ہے۔ انھوں نے اپنے بے پناہ علمی وادبی تجربات کی وجہ سے ادب کی دنیا میں اپنا الگ مقام بنا لیا ہے۔ عطیہ سید نے اپنی فکشن میں روایتی باتوں کو راہ نہیں دی بلکہ سب سے الگ ہٹ کر انسانی فکر و شعور کی تہہ تک گئیں اور علمی، تہذیبی اور فکری تجربات کے زریعے دل و دماغ پر چھا گئیں۔ انھوں نے فکشن

کو ایک نئی سوچ اور ایک نیا ذہن عطا کیا۔ان کی تحریروں میں فکر و فن کی متنوع جہات دکھائی دیتی ہیں۔ان کے افسانے نوع بہ نوع موضوعات،اسالیب،اور افکار کی ایک نئی دنیا اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہیں۔

عطیہ سید کا ذہن متنوع الجہات قسم کا ہے۔ ان کے افسانے کے مختلف مفاہیم ہوتے ہیں۔ ان کے افسانوں کے مطالب سیدھے سادھے نہیں ہوتے۔ان کی تحریروں کی فکری تہہ داری اور معنوی کثرت قاری سے یہ مطالبہ کرتی ہے کہ ان کی تحریروں کو بار بار پڑھا جائے۔ان کے افسانے پڑھتے وقت قاری کے ذہن میں کئی سوالات ابھرتے ہیں اور وہ غور و فکر پر مجبور ہو جاتا ہے۔ فلسفہ اور ادب دونوں کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے۔

> "فلسفہ آپ کی سوچ بدل دیتا ہے اور ادب بھی آپ کی دنیا تبدیل کر سکتا ہے بشرطیکہ وہ بڑا ادب ہو۔ادب سے آپ کا "احساس" بدل جاتا ہے اور فلسفہ سے آپ کا "ادراک" بدل جاتا ہے۔"[22]

نفسیات سے گہری دلچسپی اور فلسفہ پسندیدہ مضمون ہونے کے سبب عطیہ سید کے افسانوں پر ان دونوں مضامین کی گہری چھاپ نظر آتی ہے۔

فلسفہ مذہب

عطیہ سید کا عمرانی شعور زندگی کی مختلف جہات کی عکاسی کی صورت افسانوں میں جھلکیاں دکھاتا ہے یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ طبقوں اور رنگ و نسل کی حد بندی کی بنیاد پر انسانوں کی حیثیت متعین کی جاتی ہے۔اقلیتی خاندان کا کوئی فرد یا پوری فیملی اپنا مذہب اور عقیدہ تبدیل کر کے دائرہ اسلام میں داخل تو ہو جاتا ہے لیکن معاشرے میں اُسے قبولیت کی سند نہیں ملتی۔ اس کا سماجی مقام و مرتبہ اور معاشی حالت بلعموم تبدیل نہیں ہوتی۔عطیہ سید کے افسانوں میں تصوف کی سرمستی جھلکتی دکھائی دیتی ہے افسانہ "خاموشی""سدھارتھا اور گوتم بدھ "اس کی نمایاں مثالیں ہیں۔افسانہ "شہرِ ہول" میں وہ لکھتی ہیں:

"بس میں۔۔۔۔ بیٹھی نوخیز لڑکیاں ڈالروں کی جمع تفریق میں مشغول تھیں۔ شاید اس امید پر کہ طلسماتی طور پر یہ تفریق کا عمل جمع میں اور تقسیم کا عمل ضرب میں ڈھل جائے گا، یا وہ بنی اسرائیل میں سے تھیں جو ہندسوں کے سلاسل میں یوں جکڑے ہوئے ہیں کہ ان کا سود، سود ہوتے ہوئے بھی زیاں ہیں یا پھر سیسفس کی طرح پیہم تکرار کی لایعنیت کا عذاب ان پر نازل تھا۔"[23]

افسانہ "مٹھی میں بند لمحہ" میں عطیہ سید رقم طراز ہیں:

"۔۔۔نام کا ہندو ہونا یا مسلمان ہونا بھی سیاسی اور معاشرتی طور پر ہندو یا مسلمان ہونا ہے۔"

مثلاً کہیں ہندوؤں اور مسلمانوں کا بلوہ ہو رہا ہو اور تم کہیں آس پاس ہو۔ تم ملوث نہ ہونا چاہو تب بھی ہندو تمہیں ہندو اور مسلمان بھی تمہیں ہندو ہی سمجھیں گے۔ ویسے بھی مذہب کی جڑیں انسان کے اندر کافی گہری ہوتی ہیں اور رسم و رواج، اٹھنا بیٹھنا، سوچ بچار پر کسی نہ کسی رنگ میں اثر انداز ہوتی ہیں۔"[24]

افسانہ "بنتِ اسرائیل" کے حوالے سے:

"۔۔۔اچھا تو تم یہودی ہو۔ تمہاری قوم سب قوموں سے برتر، تمہارے نبی سب نبیوں سے برگزیدہ۔ اسی احساسِ برتری نے تمہیں دوسری قوموں سے الگ تھلگ کر دیا ہے۔"[25]

افسانہ "میری میرا" میں میری کہتی ہے۔

"""شاید تم بے خبر ہو کہ ایل۔ایس۔ڈی اور کچھ اور ڈرگز بعض افراد کو مذہبی تجربے سے روشناس کرواتی ہیں۔ یہ مذہبی تجربہ کیا ہے؟۔۔۔۔ ماورا کا شعور۔۔۔۔عام روزمرہ کی زندگی سے پرے، ایک آگہی اور رابطہ ابدیت سے۔۔۔ بعض اوقات مذہبی واردات خود بخود ہماری زندگی میں وارد ہوتی ہے جیسے چلتے چلتے یکدم کسی مقام پر سڑک کا

موڑ مڑتے ہی ہم کسی حسین منظر سے دوچار ہو جاتے ہیں۔ مگر اکثر ایسا نہیں ہوتا۔ دنیا میں کئی تمدن ایسے گزرے ہیں اور اب بھی ہیں جو منشیات کے ذریعے سے مذہبی تجربہ کو مشتعل کرتے ہیں اور ذہن کی حسیات میں وسعت اور گہرائی پیدا کرتے ہیں۔"[26]

عطیہ سید کے ہاں مختلف مذاہب کے حوالے سے فلسفیانہ نقطہ نظر بھی دکھائی دیتا ہے مثلاً عیسائی مذہب کے حوالے سے مثال دیکھیئے:

"اس کے بعد یوں محسوس ہوا جیسے صحرا کی بے پناہ وسعتوں سے آندھی اُٹھی، سمندر کی بے اتھاہ پہنائیوں سے بخارات کی ایک چادر جو تا حدِ نظر تن گئی۔۔۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے دو ہاتھ نمودار ہوئے جو آسمان سے زمین تک پھیلے ہوئے تھے۔۔۔ یہ خدا کے ہاتھ تھے ان کا رنگ سیاہ تھا۔ انگلیاں اور انگوٹھے چپٹے اور بھرے ہوئے تھے۔۔۔ جب میں نے ان ہاتھوں کا دیدار کیا تو مجھ پر ہیبت و رقت کی ملی جلی کیفیات طاری ہو گئیں۔ میں سجدی ریز ہوا۔ مجھے کامل یقین تھا بے شک یہ زمینوں، آسمانوں اور ان کے درمیان جو کچھ بھی ہے اور ان پر جو کچھ بھی ہے۔۔۔ ان سب کو مٹی سے بنانے والے کے ہاتھ ہیں۔"

اسی طرح افسانہ "چھ بجے کی خبر" میں بھی عیسائی مذہب کے حوالے سے کچھ سوال اٹھائے گئے ہیں۔

"سسٹر ٹریزہ جب بھی ان مجسموں کو دیکھتی ہے اسے یوں محسوس ہوتا ہے کنواری مریم اپنے دم توڑتے بچے کو دکھ سے دیکھ رہی ہے مگر پُر سکون ہے۔ اس کی گود میں لیٹا شخص تن دریدہ، خون چکیدہ ہے لیکن اس میں عجیب قسم کی طمانیت موجود ہے سسٹر ٹریزا کی آنکھیں ڈبڈبا جاتی ہیں اور وہ سوچتی ہے کہ آخر ہمیں ناکردہ گناہوں کی سزا کیوں ملتی ہے۔ کیا اس لیے کہ عیسائی اکابرین کلیسا کے مطابق ہم آدم و حوا کے ازلی گناہ کی پاداش میں اس بے چین کرہ ارض میں پھینکے گئے ہیں۔"[27]

فلسفہ سماج

دراصل نفسیات، کرداراوراس کی نفسی کیفیات کے اسباب تلاش کرنے کا نام ہے۔ جس میں انسان کے اعمال وافعال کو دیکھنے کے ساتھ ساتھ اس کے ماحول کا جائزہ بھی لیا جاتا ہے۔ جس میں اس انسان نے پرورش پائی۔ عطیہ سید اس فن میں طاق ہیں۔ وہ سماج میں رہنے والے لوگوں کی ذہنیت سے واقفیت رکھتی ہیں۔ اوراس عمل میں وہ کردار کی ذہنی کشمکش کا موازنہ اس کے ماحول سے کرتی ہیں۔ کیونکہ ماحول ہی انسان کی شخصیت کے بنانے یابگاڑنے میں اہم کردارادا کرتاہے۔ عطیہ سید کے ہاں سماجی زندگی کے وہ رنگارنگ مسائل سامنے آتے ہیں جن کا تعلق فرداور سماج سے ہے۔ مثلاً فرد کی اجتماعی زندگی، رسم ورواج، ماحول، خاندان، عدات واطوار،، فیشن، جنسی مسائل اور غربت وغیرہ۔

عطیہ سید کے افسانے بلاشبہ نئی دنیا، نئی سمت، نئی جہت، نئی سوچ اور نئے رنگ وآہنگ سے مزّین ہیں۔ عطیہ سید کا شمار ان فکشن نگاروں میں ہوتاہے جو اپنے درد مند دل، حساسیت اور وسیع مشاہدے اور زندگی کے تجربات کے سبب فکروفن کی بلندیوں کو چھونے میں کامیاب ہیں۔ عطیہ سید نے اپنے افسانوں کے موضوعات اپنے ماحول سے تلاش کیے۔ ان کے افسانوں میں موجود فکر، سوچ اور تدبر ان کے ذاتی مشاہدے کی دین ہیں۔ ان کہانیوں میں جب تجربات کا عکس دکھائی دیتاہے وہ انسانی کے قریب ترین ہے۔ انھوں نے اپنی خاص بصیرت، فکر اور سوچ کے تحت زندگی اور کائنات کے خفیہ مفاہیم کو تلاش کیا۔ لہذا عطیہ سید ہمیں اپنی طلسم اور بھید بھری فضاء سے اپنا گرویدہ بنالیتی ہیں۔

> "عطیہ سیّد کے اکثر افسانوں کے پلاٹ دکھ، درد کے گرد پروان چڑھتے ہیں۔ ڈھلوان، بلقیان کابت، چھپکلی، درویش رقصاں اور فریب آرزو وغیرہ ایسے افسانوں کی مثالیں ہیں۔ عطیہ سیّد کے ہاں پیچیدہ پلاٹ والے افسانے بھی ملتے ہیں جن میں واقعات باہم پچیدگی سے ایک دوسرے کے ساتھ مربوط دکھائی دیتے ہیں جس وجہ سے پلاٹ الجھاو کا شکار ہو جاتاہے۔ ایسے افسانوں کی مثالوں میں دائرہ، طلسم دلربا، سبز اندھیرا، پریزاد اور

درویش رقصاں وغیرہ شامل ہیں۔" جہاں کہانی کا ابھار تو کچھ اور تھا لیکن انجام کچھ اور نکلا زندگی کی پیچیدگیوں کی طرح۔"[28]

عطیہ سید نے طبقاتی کش مکش اور معاشی اونچ نیچ کا گہرا مشاہدہ کیا ہے۔انھوں نے معاشرتی تضادات اور معاشی تفاوت کے پس پردہ محرکات اور اس کے نتائج اپنے افسانوں کے موضوع بنائے ہیں۔ ہمارا سماجی ڈھانچہ کچھ اس انداز سے ترتیب دیا گیا ہے کہ امیر امیر تر اور غریب غریب تر ہی رہتا ہے۔ غربت ، بھوک اور ناداری کے ہاتھوں پریشان افلاس زدہ طبقہ بمشکل جسم وجاں کا رشتہ برقرار رکھ پاتا ہے۔ عطیہ سید نے نچلے طبقے کی زندگی کے دکھ، کرب ناکی اور تلخی عمدگی سے مصوّر کی ہے۔انسان معاشرتی حیوان کہلاتا ہے اور معاشرہ مختلف اکائیوں سے مل کر بنتا ہے۔ بظاہر بہت معمولی اور غیر اہم واقعات اور رویے نہ صرف دوسروں کو مشکلات میں ڈال دیتے ہیں بلکہ ذہنی انتشار پیدا کرنے کا باعث بھی ہوتے ہیں۔ سماجی رویوں میں بے اعتدالی اور غیر متوازن طرز عمل ذہنی مسائل کا لامتناہی سلسلہ پیدا کرتی ہے۔

عطیہ سید کے ہاں تفہیم حیات کے کئی پہلو افسانوں میں پیش کیے گئے ہیں۔ معاشرے میں بسنے والے عام افراد کے دکھ درد، احساسات اور رویوں کی مختلف صورتیں نظر آتی ہیں۔انھوں نے خاص طور پر قریبی رشتہ داروں کے دل خراش رویوں کی عکاسی کی ہے۔افسانہ نگاروں نے بصیرت افروز نظر سے معاشری رویوں کا مشاہدہ کیا ہے۔ حسد، لگائی، بجھائی، تجسس، غیبت اور شعوری ولاشعوری طور پر نقصان پہنچانے کا رویہ عورتوں میں زیادہ ہوتا ہے۔ ہمارے ہاں وسیع پیمانے پر ایک اور سماجی رویہ دیکھنے میں آتا ہے وہ یہ کہ اکثر والدین بیٹیوں کی شادی کے حوالے سے آئیڈیل ازم کا شکار ہوتے ہیں۔ اکثر بہتر سے بہتر کی تلاش میں لڑکیوں کی شادی کی عمر نکل جاتی ہے۔ یہ انتہائی تکلیف دہ صورت حال ہوتی ہے۔ جس کا شکار کئی بیٹیاں ہو چکی ہیں۔ اس جہالت زدہ معاشرے میں لڑکیوں کے حوالے سے ایک اور تکلیف دہ اور اعصاب شکن رویہ دیکھنے میں آتا ہے۔ ہمارے ہاں لڑکے کے والدین عموماً بیٹی والوں کے گھر جا کر ان کی چال ڈھال، قد و قامت، سلیقہ شعاری اور رکھ رکھاؤ کا جائزہ بازار میں رکھی گئی جنس کی طرح لیتے ہیں۔

ہمارے ملک کی جیلیں اور تھانے مجرم پیدا کرنے کے ادارے بن چکے ہیں۔ ملک میں بدامنی، دہشت گردی، چوری، ڈاکے اور دیگر سماجی و معاشرتی برائیوں میں محکمہ پولیس کے اہل کار شامل ہوتے ہیں۔ پاکستانی افسانہ نگاروں کا اس بات کا بخوبی ادراک حاصل ہے۔ محکمہ پولیس اس قدر باصلاحیت کہ اگر وہ چاہے تو مجرم سے ایسے گناہ بھی قبول کروالیتا ہے جس کی خبر مجرم کے فرشتوں کو بھی نہیں ہوتی۔ کلاشنکوف کلچر کراچی شہر کے لیے جزو لازم بن چکا ہے۔ ابتلا، آزمائش اور درد کا لمبا عرصیہ کب اور کیسے ختم ہو گا۔ اس سوال کا جواب کسی کے پاس نہیں۔ داخلی اور خارجی سطح پر شہر کا ہر فرد متاثر ہے۔ اس شہر کی ہواؤں میں دہشت، فضاؤں پر وحشت طاری ہے۔ یہاں گولیوں کی صدائیں گونجتی ہیں۔

اب ہندو مسلم فساد نہیں، مسلم مسلم فساد نظر آتا ہے۔ انتشار اور نفاق کا بیج بو کر تہذیب، تاریخ اور ورثے کو ناقابل تلافی نقصان پہنچایا جاچکا ہے۔ پاکستان کا سب سے بڑا اور جدید صنعتی شہر مسائیل و مصائب کا شکار ہو چکا ہے۔ وہاں ہر طرف موت کا کرب چھایا ہوا ہے۔ آج ہر ذی شعور شخص کو افسوس ہے کہ اس میزبان اور مہربان شہر کی فضا کو آلودہ اور تباہ کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ عطیہ سیّد کے افسانوں میں کراچی کی بدامنی موضوع بنی ہے۔ خواتین کے وہ افسانے جو کراچی کی حالیہ صورت کو پیش کرتے ہیں۔ اُن میں نگانگت، محبت اور امن کی خواہش شدت سے ابھرتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔

دہشت گردی کو پھیلانے کے لیے باقاعدہ اور منظّم جال پیلایا گیا ہے۔ ناپختہ جذبات رکھنے والے کم عمر اور حالات کے یاتھوں ستائے ہوئے نوجوانوں کی برین واشنگ کی جاتی ہے۔ شہادت کی ترغیب، پرتاثیر گفتگو، غلط اور غیر اسلامی توجیحات کے ذریعے انھیں دہشت گردی پر آمادہ کیا جاتا ہے۔ یہ سفاک مافیہ انسان اور انسانی قدروں کا قاتل ہے۔ مذہب اور جہاد کے نام پر سوانگ رچانے والے بے ضمیر نوجوانوں کو حوروں، غلمان اور جنت کا جھانسہ دے کر شیشے میں اُتارتے ہیں۔

عطیہ سید نے دہشت گردی کے محرکات اور اصل اسباب کی طرف توجہ دلائی ہے۔ اس ملک کا المیہ یہ ہے کہ بے شمار مجرم دندناتے پھر رہے ہیں لیکن بے قصور مارے جاتے ہیں۔ انسداد دہشت گردی کے نام پر

قانون نافذ کرنے والے ادارے اپنی کارکردگی دکھانے کے لیے بے قصور عورتوں اور مردوں کو مجرم ثابت کرنے کی بھرپور اہلیت رکھتے ہیں۔ افسانہ "ہمیں قتل ہو آئیں یاروں چلو" اور "درویشِ رقصاں" اس کی اہم مثالیں ہیں۔ ہمارے عقائد، مذہب اور تہذیب و ثقافت کے دائرے کہیں یک جا نظر آتے ہیں۔ کچھ رسم و رواج اور عقائد ہماری ثقافت میں ضم ہو چکے ہیں۔ عطیہ سید کے ہاں سماجی استحصال، معاشی ناانصافی اور سیاسی جبر کی متنوع صورتیں پیش کی گئی ہیں۔

اس تیز رفتار سائنسی اور مادی ترقی کے دور میں سماجی، مذہبی، تہذیبی اور اخلاقی اقدار کی تبدیلی نے سوچ اور عمل میں تضادم پیدا کر دیا ہے۔ الفاظ کے معنی بدل گئے ہیں۔ جدید تہذیب کے باسیوں سے معصومیت، خلوص اور محبت چھنتی جا رہی ہے۔ سائنسی علوم کے ہر دم تازہ انکشافات نے انسان کے حواس مجتمع کرنے کی بجائے اسے بوکھلاہٹ کا شکار کر دیا ہے۔ نفرت، بے زاری اور احساس کمتری بڑھ رہی ہے۔ فرد کی انفرادی بقا اور فلاح کے تصور سے انسانی جبلت میں خود غرضی کا عنصر بڑھ گیا ہے۔ فرد اور کائنات کے درمیان خلیج پیدا ہو رہی ہے۔ آج کے دور میں انسان ہجوم میں بھی اکیلا ہے۔ بدلتی ہوئی سماجی اور تہذیبی قدریں باقاعدہ ایک مسئلے کی شکل اختیار کر چکی ہیں۔ خاندانوں میں وضع داری باقی ہے نہ معاشرتی سطح پر اتحاد و یگانگت، رواداری اور خلوص ہے۔ بدلتی اقدار کے نتیجے میں فرد کی جذباتی اور روحانی نشو و نما میں خلا پیدا ہو گیا ہے۔ انسان کی داخلی اور اجتماعی معاشرتی زندگی میں ہم آہنگی نہیں رہی۔ معاشرتی اور تمدنی زندگی کی بگڑتی صورت حال نے داخل اور خارج میں عدم مطابقت پیدا کی ہے۔ عطیہ سید نے اس کو اپنے افسانوں میں اجاگر کیا ہے۔

ہر معاشرہ اپنی مخصوص تہذیبی اور تمدنی قدروں کی شناخت کا امین ہوتا ہے اس میں ہی اس کی بقا ہوتی ہے۔ عصری انتشار، افراد کی بے اعتمادی، سیاسی بدامنی اور دیگر کئی عوامل انسانی رشتوں کی ٹوٹ پھوٹ کا باعث بنتے ہیں اور انسان ذہنی اور روحانی مفلوک الحالی کا شکار ہوتے ہیں۔ معاشرے میں نظامِ تعلیم، کردار، سوچ، ماضی کی توانا تہذیبی روایات، اعلیٰ انسانی اقدار اور اخلاقیات کا نظام تبدیل ہونے سے انفرادی اور اجتماعی طور پر مادہ پرستی کا رجحان فروغ پا رہا ہے۔ لوگ ماڈرن ازم کے نام پر رشتوں سے دور ہو گئے ہیں۔ اب ہر فعل میں افادے کا پہلو

تلاش کیا جاتا ہے۔ عطیہ سید کے ہاں نئی اور جدید اقدار اور پرانی قدروں کے درمیان تقابل کی کیفیت بھی ملتی ہے اور ایک سطح پر ماضی کی بازیافت کا عمل بھی نظر آتا ہے۔

مشرقی تہذیب و ثقافت اور قدریں اپنی نوع اور خصوصیات کے اعتبار سے مختلف ہیں۔ یہاں احترام آدمیت اور رشتوں کی بڑی اہمیت و وقعت رہی ہے لیکن گزرتے وقت کے ساتھ مشرق کا دامن خالی ہونے لگا ہے۔ گلوبل ویلج میں فاصلے گھٹنے کی بجائے بڑھ رہے ہیں۔ ماضی کے مقابلے میں خود غرضی زیادہ ہو چکی ہے۔ عطیہ سید کے افسانے میں فینٹی کی تکنیک استعمال کر کے انسانوں پر یہ طنز کیا گیا ہے کہ آنے والے وقت میں وقت کی قلت کے باعث انسان خود کار مشینوں کے ذریعے دفن ہوا کریں گے۔ دوغلی اقدار، ملمع کاری، تصنع اور بے مقصد زندگی قابل فخر بنتی جا رہی ہے۔ اچھے اور برے کی تمیز اندھا دھند تقلید نے بچوں کی پہلی درس گاہ یعنی ماں کو بھی بدل دیا ہے۔

عطیہ سید نے نیکی اور ہمدردی کا ڈھونگ رچانے والے ریاکار اور منافق لوگوں کا پول کھولا ہے جن کا اسل مقصد نمود و نمائش اور شہرت کا حصول ہوتا ہے۔ ایسے ریاکار لوگوں کا باطن اور ظاہر یک سر مختلف ہوتا ہے۔ مختلف این جی اوز، ریلیف کمیٹیاں، اور فلاح بہبود کے دعوے دار اس کے ہوتے ہیں۔ ہمارے معاشرے میں مذہبی حوالے سے کچھ لوگ خود کو نیکی اور خیر کا ٹھیکے دار سمجھتے ہیں وہ جب چاہیں جیسا فعل کریں پاکیزہ اور اطہر رہتے ہیں۔ لیکن اپنی ذات سے وابستہ لوگوں کی معمولی سی لغزش کی سزا دینے سے نہیں چوکتے۔ ایسی مولویانہ ریاکاری کا ایک نمونہ ملاحظہ ہو۔ جس میں بیوی کا قصور صرف اتنا ہے کہ اس نے لاٹری کا ٹکٹ خریدا تھا۔

جنس

عورت اور مرد کرداروں پر مشتمل عطیہ سید کی کئی کہانیاں رومانی انداز کی حامل ہیں۔ رومانیت کی کیفیت کو سلیم آغا قزلباش اس طرح بیان کرتے ہیں۔

> "رومانیت اس کیفیت کو پالینے کا نام ہے، جب انسان کا مادی وجود ہمہ تن جذبے میں تحلیل ہو کر جسم کو پر لگا دیتا ہے۔"[29]

عطیہ سید کے ہاں رومانی افسانوں کی بڑی تعداد ملتی ہے۔ یہ رومانی افسانے مادی زندگی سے الگ تصوراتی اور تخیلاتی ماحول اور فضا پیش کرتے ہیں۔ جہاں مرد و زن کے دلوں کی دھڑکن، محبت کی فراوانی اور ان گنت تمنائیں ہیں۔ عطیہ سید کے ہاں زندگی کے رومانی پہلوؤں کی جھلک میں جذباتی رشتوں اور حسن و عشق کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ عطیہ سید نے ٹھوس اراضی حقائق کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے لیکن خواتین کی کثیر تعداد ایسی ہے جن کے ہاں غالب موضوع عشق و محبت کے تعلق پر مبنی ہے۔ ان افسانوں کے پلاٹ، کردار، مکالمے غرض پورا افسانہ رومان کی چاشنی میں ڈوبا ہوا ہے۔

بہت سی کہانیوں میں عورت مرکزی کردار کے روپ میں سامنے آئی ہیں۔ اور بہت سی کہانیاں مرد کرداروں کے گرد گھومتی ہیں۔

فلسفہ جذبات

جذبہ ''Emotion''لاطینی زبان کے لفظ ''Emover'' سے نکلا ہے جس کے معنی "حرکت یا لرزنے" کے ہیں۔

انسانی شخصیت دراصل انسانی جذبات واحساسات سے تشکیل پاتی ہے۔ فرد کا ہر عمل ہی اس کی شخصیت کی تعمیر میں بنیادی کردار ادا کرتا ہے۔ اس کا بولنا، چلنا، سونا، جاگنا، خاموش رہنا، معاملات، اخلاق، کردار اور سوچیں سب انسانی شخصیت کی پرتیں ہیں۔ ان تمام جذبوں کو جانچنا اور پرکھنا ایک افسانہ نگار کا کام ہے۔ وہ کمال فنکاری سے ان جذبوں کو مکالموں کی صورت میں قاری کے سامنے پیش کرتا ہے۔ ہر فرد ہر لمحہ اپنی جبلّت کا پابند نظر آتا ہے۔ اس کا کوئی بھی فعل سرانجام دینا اس کی جبلّت کو ظاہر کرتا ہے۔ فرد کا کسی بھی چیز کی طرف مائل ہونا اور کسی چیز سے بھاگنا اس کی جبلّت ہی کو ظاہر کرتا ہے۔ جبلّت کی بہت سی اقسام ہیں۔ مثلاً فرار، بے کسی کی حالت میں التجا کرنا، تجسس، خوراک کی جستجو، جنسی جبلّت وغیرہ۔ ہر جبلّت میں ایک جذبہ موجود ہوتا ہے۔ ''Crow and Crow'' کے مطابق۔

"ہر جبلّت ایک جذبے کی حامل ہے۔جب فرد کے فطری احساسات میں شدت پیدا ہو جائے تو وہ جذبات کا رنگ اختیار کر لیتے ہیں۔مثلاً ہمدردی، محبت، خوشی، غمی، خوف، غصّہ یہ سب فطری جبلّتیں اور احساسات ہیں۔اگر ان میں شدت پیدا ہو جائے تو وہ جذبات کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ باالفاظ دیگر جذبات اپنی شدت کی وجہ سے جانے جاتے ہیں۔"[30]

عطیہ سید کے نزدیک رشتوں کی بہت زیادہ اہمیت ہے۔ انھوں نے اپنے افسانوں میں ماں ، باپ، بہن، بھائی، بیٹا، بیٹی اور بیوی کے لیے جذباتی اندازِ تحریر اختیار کیا۔انھوں نے اپنی ہر کہانی میں کسی نہ کسی اہم مسئلے پر قلم اٹھایا ہے۔انھوں نے اپنی کہانیوں میں معاشرے کے جسم کے ناسوروں اور روح کے زخموں پر قاری ضرب لگائی۔ان کی زبان متوسط طبقے کی معیاری زبان ہے۔ عورتوں کے جذبات واحساسات کو کمال فن کاری سے بیان کرنا ان کی دیگر خوبیوں میں سے ایک خوبی ہے مثلاً افسانہ "رقص" میں موجود دونوں نسوائی کرداروں کی نفسیات ایک دوسرے سے مختلف ہے آسیہ صبر اور برداشت کی علامت جبکہ مصطفائی ضد اور نفرت کی۔آسیہ اور مصطفائی کا تعلق دو الگ الگ قوموں سے ہیں۔مصطفائی اپنی نفرت کے جذبات کا اظہار آسیہ کو تنگ کر کے کرتی ہے:

"صبح ابھی آسیہ گہری نیند سو رہی تھی کہ مصطفائی چھلانگ لگا کر بستر سے برآمد ہوئی اور شٹرانگ سے بلائنڈ کو کھینچا۔روشنی کا ایک سیلاب کمرے میں گھس آیا۔۔۔ کبھی وہ سنک کے نلکے کو پر شور آواز سے کھولتی کبھی الماریوں کو زور سے کھولتی اور بند کرتی، کبھی برتنوں کی کھنک تھی تو کبھی انڈہ تلنے کا ہنگامہ۔آخر آسیہ سے رہا نہ گیا وہ تلملا اٹھی اور مصطفائی کو پکارا۔

"کچھ تو خیال کرو۔ میں رات اتنی دیر سے سوئی ہوں اور صبح تم نے شور مچانا شروع کر دیا ہے"

یہ سن کر مصطفائی چیل کی طرح اس پر جھپٹی۔ غصے سے اس کے ڈیلے ابل رہے تھے اور ناک سرخ مرچ کی طرح لال ہو رہی تھی۔ "تم نے بھی تو رات میری نیند خراب کی تھی۔"

"میں نے؟" آسیہ ہکا بکارہ گئی "میں نے تو بڑی احتیاط برتی تھی۔"

"تمھارے جوتے چرچرا رہے تھے"

"وہ تو میں نے آتے ہی اتار دیے تھے۔"

"بعد میں اتارے تھے اور اس کے علاوہ دروازہ بھی تو کھڑاک سے کھولا تھا۔ کتابیں دھب سے میز پر رکھی تھیں اور غسل خانے میں پانی بہنے کی آواز بھی آتی رہی۔"[31]

محبت بھی ایک فطری جذبہ ہے۔ محبت کی کئی صورتیں ہیں۔ یہ صورتیں حالات اور عمر کے مطابق تبدیل ہوتی رہتی ہیں۔ عطیہ سید نے عورت کے دل میں پلنے والے محبت کے جذبات کا بھی برملا اظہار کیا ہے۔ جو مروجہ معاشرے میں لاشعور کا حصّہ بن کر بہت سی نفسیاتی الجھنوں کا سبب بنتی ہیں۔ افسانہ "ایبل اور وہ"، "آنسو کا نمک"، "عشقِ تمام"، "برگزیدہ"، "چھپکلی"، "اُڑتا پرندہ اور سنہری مچھلی" اور "میری میرا" وغیرہ میں عطیہ سید نے عورت کے دل کی گہرائیوں میں اتر کر ان کے جذبات واحساسات کو فنی مہارت سے پیش کیا ہے۔ افسانہ "ایبل اور وہ" میں ایک ایسی لڑکی کی کہانی بیان کی گئی ہے جو محبت تو کرتی ہے پر اس کے اظہار سے کتراتی ہے۔

"اس لیے کہ میرے خیال میں محبت صرف ایک شخص سے کی جاسکتی ہے۔ فطری طور پر انسان بیک وقت دو اشخاص سے پیمان وفا نہیں نباہ سکتا۔ یہ وہ جنس ہے جس میں شراکت ممکن نہیں۔[32]

"۔۔۔۔ دراصل یک طرفہ محبت ایک آشوب ہے، ذات کی شکست وریخت ہے، جب ہم چاہے نہیں جاتے تو ہم سمجھتے ہیں کہ ہم چاہے جانے کے قابل نہیں ہم اپنے آپ کو بدصورت اور کریہہ المنظر محسوس کرنے لگتے ہیں۔ نتیجتاً ہم نہ صرف اپنے آپ سے، بلکہ دوسروں سے بھی نفرت کرنے لگتے ہیں۔"[33]

مردانہ کرداروں کے محبت کے جذبات کو کمال خوبی سے بیان کیا ہے۔ مثلاً افسانہ "دائرہ"، "مٹھی میں بند لمحہ"، پریزاد "اور "آنسو کا نمک" وغیرہ۔

افسانہ "دائرہ" رومانی کہانی پر مشتمل ہے۔ جس میں محبت جیسے لافانی جذبے کو دلکش انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ اس افسانے میں نفسیات کے حوالے سے انسانی جذبات کا اتار چڑھاؤ اور ماحول کے انسانی شعور پر اثرات دکھائی دیتے ہیں۔ افسانہ عکس میں عطیہ سید جذبات کے حوالے سے لکھتی ہیں۔

"۔۔۔امکان ــــ رومان ــــ اچنبھا ــــ اسرار ــــ بھلا میرے نزدیک ان لفظوں کی کیا وقعت تھی۔ میں چالیس برس کا تھا ــــ اور جذبوں کے امکانات کھنگال چکا تھا ــــ زندگی کے سمندر سے جو سیپ میں بند موتی میرا مقدر تھے، میں نے حاصل کر لیے تھے۔ میں جوانی کی آخری سرحدوں کی طرف تیزی سے بڑھ رہا تھا ــــ خزاں کی دہلیز پر کھڑا تھا۔"[34]

انھوں نے اپنے والد ڈاکٹر سید عبداللہ کی شخصیت پر بھی ایک افسانہ "آجی" کے نام سے لکھا جس میں انھوں نے جذباتی اندازِ بیاں اختیار کیا۔

فلسفہ عروج وزوال

عطیہ سید نے بیرونی دنیا میں مقیم تارکین وطن کو درپیش مسائل کا بھی احاطہ کیا ہے۔ مشرقی اور مغربی دنیا کی تہذیب، رہن سہن، اور سماجی و معاشی مسائل میں فرق ہے۔ خالص مغربی معاشرے کی ترقی اور چکاچوند کو دیکھ کر یہ احساس ابھرتا ہے کہ شاید وہاں اقتصادی مسائل موجود نہیں ہوں گے۔ لیکن درحقیقت اس معاشرے میں نسلی تنافر اور تعصب کے سبب بھوک کا وہی عالم ہے جو ایشیائی ممالک میں پایا جاتا ہے۔ وہاں نوجوان طالبات اپنی پڑھائی کا خرچ پورا کرنے کے لیے فرٹیلٹی کلینک میں کروموسومز تک بیچتی ہیں۔ مثال کے طور پر فائر بریگیڈ کے شعبے سے تعلق رکھنے والا شخص غربت کے ہاتھوں خود جنگل میں آگ لگا دیتا ہے ہے تاکہ لوگ اسے مدد کے لیے پکاریں اور وہ آگ بجھائے اور بیوی کے لیے ادویات خرید سکے۔

ایشیائی ممالک سے کثیر تعداد میں غیر قانونی طور پر لوگ بیرونی ممالک میں جا کر قیام پذیر ہوتے ہیں۔ خفیہ رہائش گاہوں میں رہتے اور چوری چھپے رزق کماتے ہیں۔ ان کا خیال ہوتا ہے کہ حکام اس غیر قانونی نقل و حرکت سے بے خبر ہیں۔ عطیہ سید نے بیرونِ ممالک میں جا کر رہنے والے ایسے پاکستانیوں کی حالت زار سے بھی پردہ اٹھایا ہے۔ دوسری طرف ایسے تارکِ وطن بھی ہیں جو اپنی ہمت اور بساط سے بڑھ کر نوکریاں کرتے ہیں تاکہ گھر والوں کی ضرورتیں جائز طریقے سے پوری کر سکیں۔ باہر کی دنیا، رنگین، آسائشوں اور چکا چوند سے بھرپور نظر آتی ہے۔ لیکن اس دنیا کے اندر کا حال وہاں جا کر ہی پتہ چلتا ہے افسانہ "ہوٹل سلازار اس کی بہترین مثال ہے۔

امریکہ میں ورلڈ ٹریڈ سنٹر پر حملے کے بعد پاکستانی تارک وطن اور دیگر ممالک سے تعلق رکھنے والے مسلمانوں کے ساتھ برا سلوک کیا جاتا ہے۔ انھیں ہر مسلمان "القاعدہ" کارکن محسوس ہوتا ہے۔ تارکین وطن عموماً معاشی مسائل کے حل کے لیے مقامی لوگوں سے شادیاں رچا لیتے ہیں لیکن اس کا نتیجہ مخلوط النسل اولاد کو بھگتنا پڑتا ہے۔ تارکین وطن کا وہ گروہ جو اپنے مذہب، کلچر اور اچھی اقدار و روایات سے دور ہو جاتا ہے وہ اپنے جیسے دیگر لوگوں کی سُبکی اور بدنامی کا باعث ہوتا ہے۔ اس گروہ میں بہت سے لوگ اپنی بیویوں کو کمائی کا ذریعہ بنا لیتے ہیں۔ بیرونی دنیا کی آسائشات کی ایسی دلدل ہے جس میں دھنسنے والا اس سے کبھی نکل نہیں سکتا۔ عطیہ سید نے تارکین وطن کے دیگر مسائل بھی افسانوں میں پیش کیے ہیں۔

عطیہ سید کا دائرہ کار صرف اپنے ملک و وطن کے مسائل کی پیش کش تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ بیرونی دنیا کے معاملات پر بھی ان کی گہری نظر ہے۔ عطیہ سید عالمی دنیا کے مسائل سے بے خبر نہیں ہیں۔ مقتدر اقوام خود مختاری اور خود اختیاری کے نام پر مظلوم، نہتی اور کم زور اقوام کو ظلم و تشدد کا نشانہ بنا رہی ہیں۔ گروہی، طبقاتی، علاقائی اور بین الاقوامی سطح پر مفادات کے لیے کھلم کھلا استحصال کا رواج دنیا کی سپریم طاقت "امریکہ" کے ہاتھوں پروان چڑھ رہا ہے۔ اسے غیر منطقی، غیر اخلاقی اور غیر قانونی ہتھکنڈوں سے روکنے والا کوئی نہیں ہے۔

خلیجی ریاستیں اور یوگوسلاویہ میں بھی ان مہذب اقوام نے ظلم کی داستانیں رقم کی ہیں۔ ان علاقوں میں زندہ لوگوں کو دوا اور کھانا میسر نہیں۔ بموں اور گولیوں کی زد میں آئے لوگوں کی خون آلود لاشوں کے ٹکڑے سمیٹنے کے لیے کوئی نہیں آتا۔ عالمی ضمیر سویا ہوا ہے۔ یوگوسلاویہ کے ٹکڑے کرنے سے سرب، کروشیا، بوسنیا اور چیچنیا کی ریاستیں بن چکی ہیں۔ عظیم سلطنوں کے استحکام کو باقاعدہ منصوبہ بندی کے تحت کمزور کیا گیا ہے۔

خوشی، غمی، تہواروں میلوں ٹھیلوں میں ساتھ رہنے والے جانی دشمن بن گئے ہیں۔ نفرت پھیلا کر خوشیوں کی بساط لپیٹ دی گئی ہے۔ اختر جمال اس مکروہ فعل کی واشگاف الفاظ میں مذمت کرتی ہیں۔ مظلوم اور نہتے لوگوں کے قتل عام کو تہذیبی صفائی کا نام دینے والی سفاک اقوام کا ضمیر مر چکا ہے۔ اسی لیے کمزور اور بے بس لوگوں کا ردعمل شدید تر ہے۔

9/11 کے واقعے کے بعد امریکی قوم کا غصہ آج تک جاری و ساری ہے۔ ورلڈ ٹریڈ سنٹر میں چند ہزار لوگوں کی موت اور اس سینٹر کی تباہی امریکہ کی سالمیت اور خود مختاری پر بہت بڑا حملہ قرار دیا گیا ہے۔ اس ترقی یافتہ قوم نے تمام ممکنہ ذرائع سے اس واقعے کی تحقیق و تفتیش کی۔ ان واقعات کی کڑیاں مسلمانوں کے ساتھ ملنے سے سفید فام لوگوں کے نسلی تعصب کی انتہا کی بے شمار مثالیں نظر آتی ہیں۔

9/11 کے واقعے کے بعد اس مہذب قوم نے ہر اس وحشیانہ فعل کا اپنا فرض منصبی سمجھ لیا ہے جس پر انسانی اقدار شرم سار ہوتی ہیں۔ امریکی میڈیا، لیڈروں اور شہریوں نے مسلمانوں اور جہاد کے خلاف زبردست پروپیگنڈا کیا ہے۔ اب انھیں ہر مسلمان فسادی، دہشت گرد اور قاتل دکھائی دیتا ہے۔ خاص طور پر داڑھی اور عمامہ جو مسلمانوں کے مذہبی کلچر کا حصہ ہے۔ ہدف تنقید بنتی ہے۔ امریکہ ظلم و ستم کے میدان کا بے تاج بادشاہ ہے۔ جس نے دنیا کو وافر مقدار میں بارود، میزائل، بم دھماکے، چیتھڑے جسم، جلتے گوشت کی بو کا تحفہ دیا ہے۔ اسے تہذیبی صفائی، دہشت گردی کے خاتمے کا نام دیا گیا ہے۔ ماضی کے ظلم کے طریقے بوسیدہ اور فرسودہ ہو چکے ہیں۔ امریکہ جیسی جدید دیگر ترقی یافتہ اقوام نے پس ماندہ قوموں کو پاؤں تلے روند ڈالا ہے۔ عراق، افغانستان اور ایران جنگ مسلط کر دی گئی ہے۔ پاکستان ڈرون حملوں کی زد میں ہے۔ وہ تمام ممالک جن کا سینہ فطرت نے

زرد جواہر سے بھر رکھا ہے۔ان قوموں کوایک انکھ نہیں بھاتیں۔قدرتی وسائل، تیل کے ذخائر اور معدنیات وہ لعل وجواہر ہیں جن پر قبضے کے شوق نے انھیں نام نہاد خدا بنار کھا ہے۔

اس مہذب ملکوں کے عقوبت خانے ظلم و ستم کے اڈے ہیں۔جہاں قیدیوں کے ساتھ جانوروں سے بد تر سلوک ہوتا ہے۔جنگ کے دامن کے ساتھ تباہی بندھی ہوئی ہے۔ایٹمی کیمیاوی ہتھیاروں کے استعمال کے بے شمار مضمرات سامنے آرہے ہیں۔جسمانی و دماغی امراض، لا علاج بیماریاں، آلودگی، اپاہج نسلیں جدید اور آتشیں اسلحہ کے استعمال کے نتائج ہیں۔افغانستان میں طالبان کے ساتھ معصوم قوم اسی خطرناک اسلحے کی زد میں ہے۔ہوسِ اقتدار سے گرنے والی چنگاریوں نے بدخشاں کابل، ہرات، بامیان، شبر غان، دشت لیلیٰ، قندھار اور دیگر شہروں کو خاکستر کر دیا ہے۔اور جلتے خستہ تن، کٹی پھٹی لاشیں، خون میں لت پت بچے، مدد کے لیے پکارتی مائیں، چیختی ہڈیاں، دیواروں، پیڑوں اور فضاؤں میں انسانی اجسام کے ٹکڑے اور بو، آدھے ہاتھوں پیروں اور دھڑوں سے محروم بچے امریکہ کے تہذیب یافتہ ہونے کی نشانیاں ہیں۔ان شہروں میں بچے یتیم ہو چکے ہیں۔زندہ بچ جانے والے ذہنی وجسمانی معذوری کا شکار ہیں۔ظلم و ستم کو دیکھ کر شقی القلب شخص کا بھی دل دہلنے لگتا ہے۔اس کے باوجود ہمارے ملک میں ایک طبقہ امریکہ کی حمایت کرتا ہے۔

ان عالمی جنگوں کے منفی اثرات پوری دنیا میں دیکھے جا سکتے ہیں فضائی اور آبی آلودگی میں اضافہ دیکھنے میں آیا ہے۔جدید ترین اور مہلک ہتھیاروں کے استعمال سے نعشوں کے کٹے پھٹے ڈھیروں میں اضافہ ہو رہا ہے۔ امریکہ عراق اور افغانستان میں امن کے نام پر جو فوجی اور جنگی اقدامات کر رہا ہے۔ان کا دائرہ بڑھتا جارہا ہے۔ ہرات کابل، قندھار، بدخشان، بامیان، شبر غان اور بے شمار علاقوں میں موت کی ہولی کھیلی جارہی ہے۔عطیہ سید نے اس صورت حال کی عکاسی کی ہے لیکن تصویر کی یہ رُخ بھی دکھایا ہے کہ ایک ہی ملک میں مخالف و متحارب گروپ بن چکے ہیں۔وہ طالبان اور ان کی ذہنیت پر براہ راست طنز کرتی ہیں جو اسلام کے نفاذ کے دعوے دار ہیں۔وہ اپنی تنظیم اور تسلیم کی پالیسی پر عمل پیرا ہیں۔جسے وہ جہاد کا نام دیتے ہیں اصل میں وہ اقتدار کی خواہش ہے۔

زمانہ قدیم کے ہتھیاروں اور تیر تلواروں سے ادھوری جنگی تربیت کر کے خود کش حملہ آور تیار کئے جاتے ہیں۔ ناپختہ اور کچے ذہن کے نوجوانوں کو مولوی حضرات لچھے دار تقاریر کر کے اپنا گرویدہ بناتے ہیں۔ جذبہ شہادت اور جذبہ ایمانی کی اہمیت جتا کر امریکی فوجیوں اور جہازوں کو نیست و نابود کرنے کی ترغیب دیتے ہیں۔ جنت میں عیش و عشرت کے سامان کا نقشہ دکھا کر فلسفہ حیات و موت سمجھایا جاتا ہے۔ نتیجتاً ان نوجوانوں کی سڑتی گلتی لاشیں ملتی ہیں۔ زندہ بچ جانے والے نیم منہدم اور تاریک کوٹھریوں میں پابند سلاسل کیے جاتے ہیں۔ امریکہ کے پاس جدید ٹیکنالوجی اور پیشہ ور جنگی ہتھیار ہیں۔ موت کے سامنے خوراک بنا کر بھیجے جانے والے نوجوان نام نہاد علما کی وجہ سے جان گنوا دیتے ہیں۔ افغانستان اور عراق کا نام سنتے ہی دھواں، میزائل، بم اور اسی طرح کی قابل مذمت اشیا کا خیال آنے لگتا ہے۔ ان مملک کے لیے کیے گئے انتہائی اقدام کے خلاف دنیا بھر میں مظاہرے ہوتے ہیں۔ لیکن مسلمان دوسرے مسلمان بھائی پر یہ ظلم دیکھنے کے باوجود خاموش ہیں۔ عراق، ایران، افغانستان اور مقبوضہ علاقوں میں پیدا ہونے والی نئی نسل کے لیے ماضی کے خوبصورت الفاظ کے معنی اب کچھ اور ہو چکے ہیں۔ عالمی منظر نامے پر ایک اور مقبوضہ اور متاثرہ ملک فلسطین بھی عطیہ سید کا موضوع بنا ہے۔

عطیہ سید کے ہاں مسئلہ کشمیر کو بھی افسانوں کا موضوع بنایا گیا ہے۔ کشمیر میں مظالم کی نت نئی صورتیں نظر آتی ہیں۔ وہاں مذہب محفوظ نہیں اور عورتوں کی عزت پامال کی جاتی ہے۔ نوجوانوں کے ساتھ سفاکانہ سلوک عام ہے۔ تنگ و تاریک کوٹھریاں اور ٹارچر سیل کشمیری نوجوانوں سے آباد ہیں۔ اقوام متحدہ کی مصلحت پسندی اور ظلم دوستی کا ثبوت ہے کہ آج تک اس مسئلے کا کوئی حل پیش نہیں کیا جا سکا۔ شعراء نے کشمیر کے مسئلے پر صدائے احتجاج بلند کی ہے۔ کشمیریوں پر ظلم و ستم کا سلسلہ طویل عرصے سے جاری ہے لیکن آج بھی وہاں لوگوں کے حوصلے بلند اور ہمت جواں ہے۔ بھارتی افواج کی ظلم و بربریت کا یہ عالم ہے کہ نہتے کشمیریوں کا قتل عام کر کے سینے پر بہادری کے تمغے سجائے جا رہے ہیں۔ اس مثال میں وہ کشمیری نوجوان لڑکے لڑکیوں کو گولیوں سے بھوننے کے بعد انھیں دہشت گرد قرار دیا گیا ہے جب کہ غلام نبی اور نور جان فراق میں تڑپتے ہوئے ایک دوسرے کو ملنے جا رہے تھے۔ کشمیر کی وادی کا حسن بے مثل ہے اس لیے اسے جنت نشان بھی کہا جاتا ہے۔ کشمیر

کے حسن کو مانند کر دیا گیا ہے۔ وہاں بھوک افلاس اور ہر طرف بہتا خون ہے۔ عطیہ سید کے ہاں کشمیر کے موضوع پر افسانوں کے ساتھ ساتھ کئی آرٹیکل بھی ملتے ہیں۔

فلسفہ وجودیت

لاشعور کے نظریے نے ادب میں وجودیت (Existentialism) کو جنم دیا۔ یہ فلسفہ بیسوی صدی میں نمودار ہوا۔اس فلسفے نے دنیا بھر کے ادیبوں کو متاثر کیا۔ ہر سوچنے سمجھنے والے ذہن نے اس کا اثر قبول کیا۔ بیسوی صدی کو خود آگہی اور خود شناسی کی صدی بھی کہا جاتا ہے فرد کی اپنی ذات سے آگہی،اس کی آزادی اور انفرادیت سے متعلق بڑے مدلل مباحث سامنے آئے۔ وجودی فلسفہ کا بنیادی نکتہ فرد کی آزادی ہے۔ یہ فلسفہ فرد کی آزادیٔ رائے اور آزادیٔ اظہار کو بہت اہمیت دیتا ہے۔ یہ آزادیٔ رائے فرد کو اعتبار بخشتی ہے۔ یہی آزادی اصل میں انتخاب کا عمل یا فیصلہ ہے۔ جس کے بعد انسان اپنے آپ کو دریافت کر لیتا ہے۔

وجودیت اپنا ایک سائنسی نظام رکھتی ہے۔اس فلسفے کا ماننا ہے کہ انسان معروضی دنیا کی بجائے صرف اپنے تجربے کو حقیقی مانتا ہے۔ وجودی کہتے ہیں کہ انسان وہی کچھ ہوتا ہے جیسا وہ بننے کی کوشش کرتا ہے۔ اسے اپنی تقدیر پر مکمل اختیار حاصل ہوتا ہے۔عطیہ سید کے اکثر افسانوں میں وجودی اثر غالب نظر آتا ہے۔ مثلاً افسانہ "حکایتِ خونچکاں" میں لڑکا اپنی طاقت اور اختیار کو آزمانے کے لیے پہلے بلی کے بچے کو، پھر ایک حمام کے بچے کو اور اس کے بعد اپنی ماں کا قتل کر ڈالتا ہے۔ وہ یقیناً اپنی طاقت یا اختیار کو منوانے کے لیے اپنا قتل بھی کر ڈالتا۔

امریکہ کی نام نہاد ترقی یافتہ قوم میں ہر انسان صرف اپنی ذات کے بارے میں سوچتا ہے وہاں سب کو فقط اپنے وجود سے محبت ہے۔ دوسرے لوگوں پر دھیان دینے کے لیے ان کے پاس وقت نہیں ہے۔ عطیہ سید افسانہ "پریزاد" میں لکھتی ہیں:

> "اس کا معاشرہ جہاں لوگ اکائیوں کی طرح بٹے ہوئے اور جزیروں کی صورت کٹے ہوئے ہیں، جہاں افراد لذتیت کی "پیراڈاکس"(Paradox) کا شکار، لمحوں کا رس

نچوڑنے کی دوڑ میں تلخی کی تلچھٹ کھنگالنے میں مصروف ہیں کہ کسی کے پاس کسی دوسرے کے لیے وقت نہیں ہے۔ شاید وہ اسے پکار رہا تھا اپنے ہی وجود کی کرچیاں سمیٹنے کی تمنا میں کہ ہمیں اپنی ذات کا اثبات بھی دوسروں ہی کے حوالے سے ہوتا ہے۔"[35]

افسانہ "شہر ہول" میں ڈی ڈی کولٹ کا کردار شان و شوکت والی زندگی گزارتا ہے خوب صورت اور قیمتی عمارت میں اس کی رہائش ہے۔ وہ صرف اپنی ذات کو منوانے کے لیے اور لوگوں کی توجہ حاصل کرنے کے شاندار عمارت تعمیر کرتا ہے۔ وہاں لوگ اپنی ذات کو منوانے اور لوگوں کی توجہ حاصل کرنے کے لیے مختلف حربے استعمال کرتے ہیں تاکہ امریکی ان کی طرف متوجہ ہوں مگر امریکی ٹس سے مس نہیں ہوتے۔

زمان و مکان کا تصور

کوئی بھی کردار زمان و مکاں سے ماورا نہیں ہوتا۔ اس کے ہر عمل میں لکھنے والے کا عکس دکھائی دیتا ہے کردار کی عمر ظاہری حلیہ، جنس سکونت، علاقہ، رہن سہن، بول چال غرض ہر عمل میں کہانی نگار کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ اس کردار کی خوبیاں اور خامیاں اور دیگر خصوصیات کہانی کے ساتھ نہیں لکھی جاتی بلکہ ان سب کا علم ہونے کی وجہ سے کردار کو ان خوبیوں اور خامیوں سے پُر کیا جاتا ہے۔ افسانہ "آنسو کا نمک" میں رقم طراز ہیں:

"کیا تمہیں کبھی یہ تجربہ ہوا کہ بعض جگہیں اپنے آپ کو محسوس کرواتی ہیں وہ جیسے ہم میں سرایت کر جاتی ہیں" فہیم نے بدستور جھروکے سے باہر دیکھتے ہوئے کہا۔
"ہاں، مجھے معلوم ہے ایک دفعہ جب میں فلورنس میں تھی تو دانتے کے گھر اس کے کمرے میں بچھی کرسی پر بیٹھے ہوئے مجھے اس کی محبوبہ بیٹریس زرد رو بیمار پیکر دکھائی دیا تھا۔ پھر میں نے دیکھا کہ یہ بیمار پیکر آسمانوں کی طرف اُٹھ رہا ہے اور فرشتے حمد و ثنا میں مصروف ہیں جیسے کسی کلیسا کا Choir۔"[36]

افسانہ "سبز اندھیرا" سے اقتباس:

"شام!۔۔۔۔ صبح، دوپہر، شام۔۔۔۔ صرف لفظ ہیں۔ حقیقت وقت ہے۔۔۔ ایک بہتا ہوا دریا جسے لفظوں کے خانوں میں بند نہیں کیا جا سکتا۔"[37]

""" پیرس"۔۔۔ دشتِ امکاں۔۔۔ جہاں کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ جانے کس گلی کے نکڑ پر۔۔۔ کس شاہراہ کے فٹ پاتھ پر۔۔۔ کسی کیفے سر راہے یا آرٹ گیلری یا نائٹ کلب میں کوئی رومان آنکھیں بچھائے آپ کا منتظر ہو۔۔۔ یا کوئی حیرت، کوئی اچنبھا آپ کا کندھا تھپتھپائے۔۔۔ یا کوئی اسرار آپ کا راستہ کاٹے۔"[38]

افسانہ "دائرہ" کے مطابق:

ہر چیز کا ایک وقت ہوتا ہے۔۔۔ ملنے کا اور بچھڑنے کا۔۔۔ وصل کا اور فراق کا۔"[39]

"۔۔۔۔ میری کلاس فیلو برنیلی نے کیا خوب کہا تھا کہ تم میں اور ہم میں یہی فرق ہے کہ تم ابدیت میں بستے ہو اور ہم لمحوں میں۔ تم سمجھتے ہو کہ شاید تمہیں ہمیشہ زندہ رہنا ہے اور ہم جانتے ہیں کہ لمحے ہماری زیست کا اصل جوہر ہیں۔"[40]

افسانہ "حکایتِ خونچکاں" میں خیال افروز ہیں:

"ویسے تو وقت ایک بہاؤ ہے۔ اسے ٹکڑوں میں تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔ نہ وجود کی سیال کیفیتوں کے آغاز و اختتام کو کسی خاص لمحے سے منسوب کیا جا سکتا ہے۔"[41]

تصوفانہ رجحان

عطیہ سید کے ہاں متصوفانہ رجحان داخلی و خارجی دونوں حوالوں سے موضوع بنتا ہے۔ تصوف کا تعلق انسان کی ظاہری زندگی سے آدمیت کے تعلق کی وجہ سے ہے۔ خدمت خلق، احترامِ آدمیت، اخلاقی اقدار، ایثار و قربانی جیسے موضوعات بھی اس میں شامل ہیں۔ اس طرح متصوفانہ افکار و خیالات بھی عطیہ سید کے افسانوں کا حصہ بنتے ہیں۔ ان کے ہاں فلسفیانہ نظریاتی اور اساس پر مبنی افسانوں میں روحانی و باطنی مشاہدات اور اس سے وابستہ کیفیات کی مختلف جہتیں پیش کی گئی ہیں۔

افسانہ "میری میرا" اور افسانہ "کرپکے اور چینی کمرہ" میں فلسفیانہ و متصوفانہ عناصر روح، مادہ، فنا اور موت کا فلسفہ پیش کرتے ہوئے آدمِ خاکی کی عظمت اور زندگی کی اصل حقیقت بتائی گئی ہے۔ عطیہ سید نے آشوبِ ذات اور باطن کی سرگزشت کو کرداروں کی ذہنی کش مکش کے پس منظر میں چابک دستی سے افسانے کا حصہ بنایا ہے۔ یہ کردار روحانی و مذہبی شعور کا پرچار کرتے ہوئے روحانی بانجھ پن اور اخلاقی انحطاط کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ عطیہ سید کے ہاں کائنات کے اسرار و رموز سوال و جواب کی صورت میں بیان ہوئے ہیں۔

عطیہ سید کے ہاں روحانی و اخلاقی رجحانات ملفوظات اور کرداروں کی باہم گفت گو کی صورت ملتا ہے۔ حرص، طمع، جھوٹ اور دنیا کے تماشے اور کھیل کود آزمائش ہیں۔ زندگی اور موت دونوں حقیقتیں ہیں لیکن زندگی اور کائنات کے بارے میں مثبت سوچ موت اور منفی خیالات کے خوف سے نجات دلاتی ہے۔ علم اور عمل دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ موت یقینی ہے اور اس کے لیے زادِ راہ کی ضرورت ہے جو عمل سے حاصل ہوتا ہے۔

انسان کو حیات کے لامتناہی سمندر سے ایک لمحہ عرفان کا حاصل ہو جائے تو وہ جام جہان نما کا مالک بن جاتا ہے۔ روحانی و باطنی خود احتسابی کے عمل سے روحانی ترفع حاصل ہوتا ہے۔ انسان مائل بہ شر ہے اور جس پر نظر کرم ہو جائے وہ دنیا کا خوش قسمت ترین انسان بن جاتا ہے۔ عطیہ سید کرداروں میں صوفیانہ خصائص اُجاگر کرتی ہیں۔ کثافتوں کی موجودگی میں باطنی پاکیزگی ممکن نہیں ہے۔ عطیہ سید کا متصوفانہ رجحان کرداروں کے عمل، اخلاق اور صوفیانہ گفتگو کے اکتساب کے ذریعے نظر آتا ہے۔ داخلی و باطنی کرب و کیفیات آگے بڑھنے کی منزل ہیں اور وقت فنا کا استعارہ ہے۔ ماضی اور حال کے درمیان وقت کا بہاؤ تسلسل سے جاری ہے۔

عطیہ سید کے ہاں تنہائی، ذہنی و نفسیاتی خلفشار، وجود کی بے معنویت، فرد کی دبی ہوئی آواز، پہچان اور شناخت کا مسئلہ بھی نظر آتا ہے۔ سائنسی و مادی ترقی نے انسان سے ذہنی اور روحانی سکون چھین لیا ہے۔ انسان مسلسل کرب میں مبتلا ہے۔ سناٹا، اکلاپا اور اجنبیت کے درمیان گھرا ہوا انسان اپنے ہونے یا نہ ہونے کے سوال کا جواب تلاش کر رہا ہے۔ فرد اپنی تلاش میں گم ہے۔ یہ روحانی و باطنی انحطاط نئے معاشرے کی دین ہے۔ عطیہ سید کے بیشتر افسانوں میں تصوف اور فلسفہ کا رجحان ملتا ہے۔ علاوہ ازیں ان کے ہاں یہ موضوع عام نظر آتا

ہے۔عطیہ سید کے ہاں متصوفانہ رجحان اور روحانی روّیے بھی دکھائی دیتے ہیں۔ان کے افسانوں میں جگہ جگہ روحانیت اور رومانیت کے عمدہ نمونے نظر آتے ہیں۔ یہ روحانی روّیے کہانی کی خوب صورتی میں مزید اضافہ کرتے ہیں۔

"یہ روحانی رویے عطیہ سیّد کے افسانوں کی تاثیر کو بڑھادیتے ہیں اور قاری کی دلچسپی کو کہانی کی آخر تک قائم ودائم رکھتے ہیں۔"دائرہ" بھی صوفیانہ نقطہ نظر سے لکھی گئی کہانی ہے جس میں فریدے کا عشق کہانی کار کے وجود کا حصہ بن جاتا ہے اور "انکشافِ ذات سے ہمکنار ہونے کے بعد عشق کی کلفتیں لطف وانسباط میں بدل جاتی ہیں۔فریدے اور وہ ایک ہو جاتے ہیں۔ دوئی کا تصور مٹ کر اکائی کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ رقص درویشاں روحانی سرخوشی کا ایک زاویہ بن کر دائرے کی تکمیل کرتا ہے۔"[42]

عطیہ سید کے ہاں روحانی روّیوں کی کئی مثالیں دیکھی جاسکتی ہیں۔مثلاً

"میں کچھ دیر دھوپ میں بیٹھنے کے بعد گرجا گھر کی عمارت کی طرف چلنے لگا اور "کنواری مریم" والے صدر دروازے سے اندر داخل ہو گیا۔اندر ایک قدیم نیم تاریکی نے میرا استقبال کیا۔۔۔کونوں میں مختلف ولیوں اور صوفیاء کی تصویریں رکھی تھیں اوران کے گرد موم بتیوں کی مدھم روشنی جھلملا رہی تھی۔مرکزی چبوترے کے عقب میں دریچوں میں رنگ برنگے شیشوں کے ٹکڑوں سے بائبل کی مختلف کہانیاں کی منظر کشی ہوئی تھی۔"[43]

ایک اور مثال دیکھیں:

"نیچے چبوترے کے عین وسط میں کنواری مریم کا بت بیٹھا ہے جس کی گود میں نوزائیدہ بچہ نہیں بلکہ ایک نوجوان لیٹا ہے۔۔۔زخموں سے چورچور، پیروں میں کیلیں ٹھکیں، سینے میں چھوٹی سی صلیب گڑی۔کنواری مریم زخمی آنکھوں سے اپنے بیٹے کو تک رہی

ہے۔ یہ یسوع مسیح ہے جس نے انسانوں کی پلکوں پر لرزتے آنسوؤں کو پی لیا، اور یوں اپنے اندر سمویا کہ صلیب اس کا مقدر ٹھہری۔"[44]

یہ صوفیانہ فضا کہانی کے حسن میں نہ صرف اضافے کا سبب بنتی ہے بلکہ قاری کی دلچسپی کے عنصر کو بھی بڑھاتی ہے۔

"سامنے دیوار پر بہت بڑی صلیب نصب تھی جس سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی مصلوب بدن مجسمہ کی صورت میں لپٹا تھا۔ صلیب سے نیچے چبوترہ پر دو دیو قامت شمعیں روشن تھیں۔"[45]

"کہانیاں بے شمار ہیں، لیکن میں صرف ایک بار ہوں۔ اس پہ تشویش کہ میں جل بجھی تو کیا ہو گا۔ سو تمنا ہے کہ یہ الف لیلیٰ جاری رہے اور میں ہر رات خوفِ مرگ سے کہانی میں زندہ رہوں اور کہانی کو بھی زندہ رکھوں۔"[46]

حوالہ جات

---

[1]۔ نورین رزاق، ڈاکٹر، "اُردو افسانے کی روایت اور پاکستانی عطیہ سید۔۔۔ تحقیقی و تنقیدی مطالعہ (1947 سے عصرِ حاضر تک" مقالہ برائے پی ایچ۔ڈی (اُردو)، مملوکہ نیو کیمپس لائبریری، لاہور: پنجاب یونیورسٹی، 2005۔2012ء، ص 383

[2]۔ راجا نئیر، انٹرویو از عطیہ سید، 17 اکتوبر 2019ء

[3]-اے بی اشرف، سلمیٰ بینلی،ڈاکٹر۔"عطیہ سید کی کہانیوں کا تجزیاتی مطالعہ"مشمولہ: مجلّہ سپوتنک(ماہنامہ) جلد نمبر16،شمارہ نمبر5۔لاہور: سپوتنک دی مال،2005ءص141

[4]- حمیرا اشفاق،"جدیداُردو فکشن(عصری تقاضے اور بدلتے رجحانات)"لاہور،سانجھ،اکتوبر 2010ء،ص18

[5]-"آنسو کا نمک"مشمولہ:"خزاں میں کونپل"ص208

[6]-"واپسی"مشمولہ:"دشت، بارش اور رات"ص100"

[7]-"شہر ہول"مشمولہ:"خزاں میں کونپل"ص56

[8]-"دو چڑیاں"مشمولہ:"دشت، بارش اور رات"ص124

[9]-"طلسمِ دل رُبا"مشمولہ:"دشت، بارش اور رات"ص68

[10]-"طلسمِ دل رُبا""دشت، بارش اور رات"ص84

[11]-"دہلیز"مشمولہ:"دشت، بارش اور رات"ص21

[12]-"بیلاروما"مشمولہ:"دشت، بارش اور رات"ص146

[13]-اے بی اشرف، سلمیٰ بینلی، ڈاکٹر۔"عطیہ سید کی کہانیوں کا تجزیاتی مطالعہ"مشمولہ: مجلّہ سپوتنک(ماہنامہ) جلد نمبر16،شمارہ نمبر 5۔ لاہور: سپوتنک دی مال،2005ءص141

[14]-"بلقیان کابت"مشمولہ"دشت، بارش اور رات"ص17

[15]-عطیہ سید سے انٹرویو،15جنوری2021ء

[16]-حامد بیگ، مرزا،ڈاکٹر۔"نسوانی آوازیں"۔لاہور،الاکو منیش پٹیالہ گراؤنڈ، س-ن، ص87

[17]-"فریبِ آرزو"مشمولہ:"حکایاتِ جنوں"ص115،114

[18]-"کرسمس کی شب"مشمولہ:"خزاں میں میں کونپل"ص37

[19]-عطیہ سید،"خزاں میں کونپل"،ص20

[20]-عطیہ سید(فلیپ)،"دشت،بارش اور رات"

[21]-عطیہ سید(فلیپ)،"دشت،بارش اور رات"

[22]-"عطیہ سید سے انٹرویو،15 جنوری 2021ء

[23]-"شہرِ ہول"مشمولہ:"خزاں میں میں کونپل"ص47

[24]-"مٹھی میں بند لمحہ"مشمولہ:"حکایاتِ جنوں"ص159

[25]-"بنتِ اسرائیل"مشمولہ:"خزاں میں کونپل"ص150

[26]-"میری میرا"مشمولہ:"خزاں میں کونپل"ص120

[27]-"چھ بجے کی خبر"مشمولہ:"خزاں میں کونپل"ص125"

[28]-اے بی اشرف، سلمیٰ بینلی، ڈاکٹر-"عطیہ سید کی کہانیوں کا تجزیاتی مطالعہ"مشمولہ: مجلّہ سپوتنک(ماہنامہ)جلد نمبر16،شمارہ نمبر5-لاہور: سپوتنک دی مال،2005ء ص143

[29]- بحوالہ سلیم آغا قزلباش،ڈاکٹر،"جدید اردو افسانے کے رجحانات"،کراچی:انجمن ترقی اُردو،2000ء،ص123

[30]- Crow and Crow, Educatinal psychology, American Book company New York, 1963, P.320

[31]-"رقص"مشمولہ:"حکایاتِ جنوں"ص13

[32]-"ایبل اور وہ"مشمولہ:"خزاں میں کونپل"ص180

[33]-"برگزیدہ،مشمولہ:"خزاں میں کونپل"ص241

34-"عکس"مشمولہ:"حکایاتِ جنوں"ص58

35-افسانہ"حکایتِ خونچکاں"مشمولہ:"خزاں میں کونپل"ص89

36-"آنسو کا نمک"مشمولہ:"خزاں میں کونپل"ص216

37-"سبز اندھیرا"مشمولہ:"خزاں میں کونپل"ص37،38

38-"عکس"مشمولہ:"حکایاتِ جنوں"ص58

39-"حکایاتِ جنوں"ص72

40-"کرسمس کی شب"مشمولہ":"خزاں میں کونپل"ص35

41-"حکایتِ خونچکاں"مشمولہ:"حکایاتِ جنوں"ص144

42-اے بی اشرف، سلمیٰ بینلی، ڈاکٹر۔"عطیہ سید کی کہانیوں کا تجزیاتی مطالعہ"مشمولہ: مجلّہ سپوتنک (ماہنامہ) جلد نمبر 16، شمارہ نمبر 5۔لاہور: سپوتنک دی مال، 2005ء ص143

43-"عکس"مشمولہ:"حکایاتِ جنوں"ص57

44-"چھ بجے کی خبر"مشمولہ:"خزاں میں کونپل"ص125،124

45-"جلوہ"مشمولہ: حکایاتِ جنوں، ص42

46-"کہانی زندگانی"مشمولہ:"دشت، بارش اور رات"ص7

محاکمہ

عطیہ سید عہدِ حاضر کی ممتاز اور نمائندہ فکشن نگار ہیں جن کی ادبی حیثیت غیر معمولی ہے۔ وہ معروف عالم، ادیب، مفکر اور استاد ڈاکٹر سید عبداللہ کے گھر 9 جون 1942 کو لاہور میں پیدا ہوئیں ۔ عطیہ سید کے آباو اجداد ہندوستان میں اسی راستے سے داخل ہوئے جس سے بابر وارد ہوا تھا اور پنجاب میں چکوال کے علاقے میں آباد ہو گئے۔

عطیہ سید کا تعلق علمی وادبی گھرانے سے ہے۔ عطیہ سید کے والد ڈاکٹر سید عبداللہ عالم ، محقق، مفکر، ادیب اور استاد تھے۔ انھیں شاعری سے بہت لگاؤ تھا۔ وہ اورینٹل کالج کے پرنسپل تھے، اس کے علاوہ وہ پاکستان اُردو اکیڈمی کے ڈائریکٹر اور اردو دائرہ معارف اسلامی کے مدیر بھی رہ چکے تھے۔ ان کی مشہور تصانیف میں ''اشاراتِ تنقید'' نقدِ میر'' مسائلِ اقبال اور ''اعجازِ اقبال'' شامل ہیں۔ عطیہ سید کی والدہ بھی شاعری کا شغف رکھتی تھیں۔

عطیہ سید کی شخصیت کا خارجی تاثر بہت ہی شاندار ہے، وہ ایک صاحب علم خاتون ہیں۔ لکھنے پڑھنے کا عمدہ ذوق رکھتی ہیں۔ انھوں نے لکھنے سے قبل تمام تر مشرقی اور مغربی ادب پڑھ رکھا تھا۔ وہ جسمانی اور ذہنی طور پر کافی فعال خاتون ہیں۔ وہ ہر وقت متحرک رہتی ہیں۔ خوش لباس، خوش مزاج اور خوش گفتار ہیں۔ انھیں خوبیوں کی وجہ سے وہ اپنی دوستوں اور تمام تر علمی وادبی حلقوں میں مقبول ہیں۔ ان سب کے ساتھ ساتھ عطیہ سید ایک محنتی اور قابل استاد بھی ہیں۔ وہ مختلف تعلیمی اداروں میں علاّمہ اقبالؒ اور مولانا جلال الدین رومیؒ پر لیکچرز دیتی ہیں۔ عطیہ سید ایک ادیبہ ہونے کے ساتھ ساتھ اعلیٰ انسان بھی ہیں۔ وہ پُر خلوص، تہہ دار پیچیدہ، انسان دوست، اور منفرد فکر و فن کی مالک ہیں۔ وہ امن پسند ہیں۔ انھوں نے اپنی کہانیوں میں ہمیشہ امن کا پیغام دیا۔ وہ دنگا فساد، خون خرابے اور قتل و غارت کے شدید خلاف ہیں۔ وہ ساری دنیا کے انسانوں کو پُرسکون اور خوشگوار زندگی گزارتے ہوئے دیکھنا چاہتی ہیں۔

اُردو ادب میں عطیہ سید کی مختلف حیثیتیں ہیں۔ وہ افسانہ نگار ہونے کے ساتھ ساتھ ناول نگار، مفکر، کالم نگار، ماہرِ اقبالیات، مترجم اور استاد بھی ہیں۔ تاہم ان کی اصل حیثیت ایک بے مثل افسانہ نگار کی ہے۔ انھوں نے اپنے افسانوی سفر کا آغاز 1987ء میں کیا۔ اور اپنا پہلا افسانہ "کرسمس کی شب" رسالہ "فنون" میں احمد ندیم قاسمی کے توسط سے شائع کیا۔ دوستوں واحباب اور قارئین سے ملنے والی داد نے عطیہ سید میں مزید لکھنے کا شوق پیدا کیا اور اس کے بعد انھوں نے دوسرا افسانہ "شہرِ ہول" لکھا۔ جو کہ چھ مہینے میں مکمل ہوا۔ اس کے بعد تیسرا افسانہ "ہوٹل سلازار" لکھا۔ یوں عطیہ سید نے یکے بعد دیگرے کئی افسانے لکھے۔

عطیہ سید کی تخلیقات کی تعداد بہت طویل نہیں ہے۔ مگر اس کے باوجود ان کی تخلیقات اُردو ادب میں ایک قیمتی سرمایہ ہیں۔ انھوں نے اب تک تین افسانوی مجموعے اور ایک ناول لکھا ہے۔ علاوہ ازیں انھوں نے بہت سی انگریزی کتب کے تراجم بھی کیے ہیں۔ انھوں نے کئی فلفیانہ کتب لکھ کر بھی فلسفے کے شعبے میں گراں قدر خدمات سرانجام دی ہیں۔ انھوں نے علامہ اقبالؒ پر ایک فلسفی کی حیثیت سے بہت سا کام کیا ہے۔ عطیہ سید کا شمار ان لوگوں میں ہوتا ہے جنھوں نے بہت کم لکھا مگر جو لکھا وہ معیاری ہے۔

عطیہ سید کا ناول "غبار 1997ء میں منظرِ عام پر آیا اس کا دوسرا ایڈیشن "2012ء میں منظرِ عام پر آیا۔ جس کو سنگِ میل پبلی کیشنز نے شائع کیا۔ یہ ناول 144 صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ ایک نفسیاتی اور جنسی مطالعہ ہے۔ "غبار" میں ایک پاکستانی گھریلو کہانی بیان کی گئی ہے۔ یہ ناول ایک نفسیاتی مطالعہ ہے۔ یہ موضوع کے لحاظ سے ایک منفرد ناول ہے۔ یہ ایک ایسے گھرانے کی کہانی ہے۔ جن کا باپ ان کو چھوڑ کر باہر کے ملک چلا جاتا ہے۔ اور ایک پاکستانی لڑکی سے شادی کر لیتا ہے۔ پاکستان میں اس کے بچے باپ کے چلے جانے کے بعد ذہنی ا اور نفسیاتی مسائل الجھنوں کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اس ناول کو نوجوانوں کی نفسیاتی الجھنوں اور ذہنی کیفیات کی ترجمانی قرار دیا گیا ہے۔ یہ ناول نوجوانوں کے جنسی اور نفسیاتی مسائل پر عطیہ سید کی ایک کامیاب کوشش ہے۔ عطیہ سید کا دوسرا ناول بھی زیرِ اشاعت ہے۔

صاحبِ طرز ادیبہ، افسانہ نگار، ناول نگار اور مترجم عطیہ سید کا شمار ان خواتین افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے جنھوں نے اپنے نئے انداز، اسلوبِ بیاں اور انوکھے موضوعات کی بدولت اُردو ادب میں بہت جلد اپنا مقام بنالیا۔ انھوں نے تخلیقی اعتبار سے بہت فعال زندگی بسر کی۔ ان کے یہاں کسی لحظہ ٹھہراؤ دکھائی نہیں دیتا۔ اُن کی تخلیقات کی تعداد بہت زیادہ نہیں مگر انھوں نے جو بھی لکھا اُس نے اُردو ادب کو ایک نئی جہت عطا کی ہے۔

عطیہ سید اپنی زندگی اور فن کے بارے میں ایک منفرد اور انوکھا روّیہ اختیار کرتی ہیں۔ انھوں نے بیک وقت مشرقی اور مغربی معاشرت کی کہانیاں لکھیں۔ اُن کے ہاں تکنیک کے نئے تجربات ملتے ہیں۔ انھوں نے اپنی نثر میں فلسفیانہ اور شاعرانہ انداز اختیار کیا۔

عطیہ سید کی بیشتر کہانیاں شعور، لاشعور اور تحت الشعور کے انسانی کردار پر اثرات کا مطالعہ کرتی ہیں۔ اس صورت حال میں وہ بیک وقت سماجی اور نفسیاتی حقیقت نگار کے طور پر سامنے آئی ہیں۔ وہ حقائق کو بنیاد بنا کر افسانے تخلیق کرتی ہیں۔ وہ اپنے کرداروں کے تجزیے سے انسانی نفسیات کے نت نئے دائرے تشکیل دیتی ہیں۔

عطیہ سید اپنی شخصیت اور اپنے فن دونوں میں انفرادیت کی حامل ادیبہ ہیں۔ عطیہ سید نے کبھی کسی ادیب کی پیروی کرتے ہوئے نہیں لکھا بلکہ سب سے الگ اندازِ تحریر اختیار کیا۔ عطیہ سید کی یہی انفرادیت پسندی انھیں اپنے ہم عصر افسانہ نگاروں سے منفرد حیثیت کی حامل افسانہ نگار بنادیا ہے۔ عطیہ سید کے افسانے اپنے اندر گہری معنویت لیے ہوئے ہیں۔ جس کو سمجھنا عام قاری کے لیے قدرے دشوار ہے۔ وہ انٹیلیکچوئلز کے لیے لکھتی ہیں۔ عطیہ سید کو اپنے نقادوں سے اکثر یہ شکایت رہتی ہے کہ وہ ان کی فکشن کو صحیح طور سمجھ نہ سکے۔

عطیہ سید کے افسانے امریکی طرزِ معاشرت کو اپنا موضوع بناتے ہیں، علاوہ ازیں انھوں نے مشرقی طرزِ معاشرت کی کہانیاں بھی لکھیں ہیں۔

عطیہ سید کے اسلوب میں تجزیاتی اور فلسفیانہ انداز دکھائی دیتا ہے۔ یہ انداز نہ صرف افسانے کی ضرورت محسوس ہوتا ہے بلکہ افسانے کے حسن کو چار چاند لگا دیتا ہے۔ تمام کردار افسانے کے ماحول، حالات اور فضاء کی ضرورت کے عین مطابق ہیں۔ اس انداز نے مصنفہ کے اسلوبِ بیان میں دلکشی اور خوب صورتی میں اضافہ کیا

ہے۔عطیہ سید کرداروں کی نفسیات کی ترجمانی فلسفیانہ انداز میں کرتی ہیں۔ یہ فلسفیانہ انداز کہیں بھی خشک اور بوجھل محسوس نہیں ہوتااور قاری کی دلچسپی برقرار رہتی ہے۔

عطیہ سید نے اُردو افسانے کے نہایت توانا لہجے میں زندگی کے بدلتے تناظر نہ صرف بتائے بلکہ ان تبدیلیوں کے اثرات بھی حقیقت پسندی سے دکھائے۔ عطیہ سید کی ایک خاص بات یہ ہے کہ وہ ہر طرح کے حالات سے موضوع منتخب کرلیتی ہیں۔اور اسے بہ احسن نبھاتی بھی ہیں۔

عطیہ سید افسانہ نگاری کے فن سے مکمل طور پر آشنا ہیں۔ کہانی کہنا ان کی فطرت کا حصّہ معلوم ہوتا ہے۔ آغازِ زندگی سے ان کے مطالعہ کرنے کی عادت اور شوق اس بات کا ثبوت فراہم کرتے ہیں کہ وہ افسانہ نگاری پر مکمل دسترس رکھتی ہیں۔ کسی بھی لمحے ان کا قلم سے رابطہ ٹوٹتا نہیں ہے۔

عطیہ سید زندگی کی تلخ حقیقتوں کو اپنے عمدہ اسلوب اور زباں سے شیریں تر بنادیا ہے۔ان کی کہانیاں نہ صرف قاری کے لیے دلچسپی کا باعث بنتی ہیں بلکہ قاری زندگی کے حقائق سے بھی آگاہ ہوتا چلا جاتا ہے۔

عطیہ سید سادہ اور اور سلیس زبان میں گہری اور باریک باتیں کرتی ہیں۔ان کے ہر لفظ کے پیچھے ایک مکمل اور وسیع جہاں موجود ہوتا ہے۔ انسان کی فطرت اور نفسیات سے مکمل واقفیت ان کے افسانوں کی نمایاں خصوصیت ہے۔ان کے چھوٹے چھوٹے جملوں کے بے انتہا گہری حقیقت چھپی دکھائی دیتی ہے۔

انھوں نے مذہب ، تصوف، معاشرت، معشیت اور انفرادی اخلاقیات کے کئی قائدے اور قانون فلسفیانہ انداز میں پیش کیے۔افراد کی داخلی زندگی سے اجتماعی زندگی تک کے تمام مسائل کو اپنی فکشن میں برتا۔ وہ معاشرے خاص طور پر امریکی طرزِ زندگی کی عمدہ تصویر کشی کرتی ہیں۔ان کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ وہ کردار کے ارتقا کو خوب صورتی سے نبھاتی ہیں۔ عطیہ سید جس واقعے کو بیان کرنا چاہتی ہوں یا جس کردار کی خوبی یا خامی دکھانا چاہتی ہوں تو افسانے کی فضاء اور ماحول کو اس واقعے اور کردار کے عین مطابق ترتیب دے دیتی ہیں۔

عطیہ سید اکثر جگہ اپنے کرداروں کے حلیہ ،لباس، چال ڈھال اور دیگر خصوصیات قاری کو بتا دیتی ہیں اور بعض اوقات وہ کرداروں کی گفتگو سے ان کی جملہ خصوصیات گنوا دیتی ہیں۔ وہ کرداروں کو اتنے دلچسپ انداز

میں پیش کرتی ہیں کہ قاری، ناظر یا سامع متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ پاتا۔ عطیہ سید نے بعض مقامات پر فینٹسی سے کام لیا ہے۔ وہ معلوم سے نامعلوم تک کا سفر کروا کر حیرت کی اتاہ گہرائیوں میں لے جاتی ہیں۔ اس عمل میں وہ موجودہ لمحات کے اندر چھپی حقیقتوں کو انسانی فطرت کے ساتھ ہم آہنگ کر کے اس طرح پیش کرتی ہیں کہ یہ فرضی زندگی کی کہانی، اصل زندگی کے مقابلے میں زیادہ بہتر اور پُرکشش محسوس ہونے لگتی ہے۔ قاری جب ان کہانیوں میں موجود مسائل کا ادراک کرتا ہے تو وہ آیندہ کی مشکلات سے لڑنے کے لیے لاشعوری طور پر تیار ہو جاتا ہے۔

جب بھی کوئی ادیب اپنا ملک چھوڑ کر غیر ملک میں پناہ گزین ہوتا ہے تو اس سفر کا عکس اس کی تخلیقات میں صاف دکھائی دیتا ہے اور عطیہ سید کا شمار ایسے افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ جن کے ادبی سفر کا آغاز ہی نیویارک میں قیام کے دوران ہوا۔ عطیہ سید نے کئی ممالک کے دورے کیے اور ان ادوار سے حاصل ہونے والے تجربات، انسانی برتاؤ، ظلم اور ناانصافی جیسی قدروں کو اپنے افسانوں میں جگہ دی۔ عطیہ سید فرد کی بے بسی اور مجبوری کو موضوع بناتی ہیں۔ اور انسان کے بنیادی رشتوں کی بدلتی ہوئی صورت حال کو اپنے افسانوں میں پیش کرتی ہیں۔

عطیہ سید اپنے کرداروں کی یوں تصویر کشی کرتی ہیں کہ اس پر خاکہ نگاری کا گمان ہونے لگتا ہے۔ وہ محض چہرہ نمائی اور خدوخال ہی بیان نہیں کرتیں بلکہ کردار کی نفسی کیفیات، اس کے مزاج و عادات اور طرزِ حیات کو بھی اجاگر کرتی ہیں۔

عطیہ سید کے ہاں لاشعوری محرکات کے حامل کرداروں کی بہتات ہے۔ یہ کردار نفسیاتی الجھنوں اور پیچیدگی کا شکار ہونے کے ساتھ ساتھ مختلف نفسیاتی بیماریوں میں مبتلا دکھائی دیتے ہیں۔ یہ کردار اپنی ذات کے علاوہ اپنی نفسی کیفیتوں سے بھی نبرد آزما نظر آتے ہیں۔ ان میں سے بیش تر کردار شکی مزاج، تنگ نظر، خوف زدہ اور قدیم روایات کے اسیر دکھائی دیتے ہیں۔

عطیہ سید کے یہ تمام افسانے رومانی انداز کے ہیں۔ لیکن یہ رومانی فضاء پڑھنے والے کو خواب و خیال کی دنیا نہیں لگتی بلکہ اس میں حقیقی عنصر کار فرما نظر آتا ہے۔ اور یہ عطیہ سید کا وصف ہے کہ انھوں نے ان افسانوں میں حقیقی تجربات واحساسات کو رومانی لبادہ اُوڑھ کر پیش کیا ہے۔ المختصر ہم کہہ سکتے ہیں کہ عطیہ سید کے افسانے رومان اور حقیقت نگاری کا حسین امتزاج ہیں۔

عطیہ سید کی کہانیاں حقیقی زندگی کی عکاّس ہیں۔ ان کے افسانوں میں تازگی کا احساس، نئے پہلو، حقیقت نگاری اور تکنیک کے نئے تجربات ملتے ہیں۔ عطیہ سید اپنے معاصر افسانہ نگاروں میں منفرد و ممتاز مقام رکھتی ہیں۔ ان کے افسانوں میں جدید دور کے انسان کا المیہ نظر آتا ہے۔ عورت کے دکھ، طبقاتی کشمکش، جبر کا احساس اور جبر کے خلاف پیدا ہونے والے ردِ عمل اور انسان کے اندر چھپے رنج و غم کا اظہار ان کے خاص موضوعات ہیں۔

عطیہ سید کے افسانے سماجی حقیقت نگاری کا عمدہ مرقع ہیں۔ ان کے افسانوں میں سماج کے اندر موجود نچلے طبقے کے افراد کے مسائل کی واضح جھلک موجود ہے۔ ان کی کہانیوں میں ٹھنڈک اور متانت کا احساس ہوتا ہے۔ انھیں اپنے افسانوں پر پوری دستگاہ حاصل ہے انھوں نے تہہ در تہہ اپنے افسانوں کی تعمیر کی اور بامعنی سماجی شعور سے لبریز تخلیقی افسانے لکھے۔ عطیہ سید نے متوسط طبقے کی اخلاقی، معاشی اور ذہنی زندگی کی بہترین تصویریں پیش کیں۔ انھوں نے مشرقی اور مغربی معاشرے میں موجود اقدار پر جارحانہ طور پر طنز کیا۔

عطیہ سید کی زیادہ تر کہانیاں امریکن طرزِ زندگی اور اس کے سماج کے گرد گھومتی دکھائی دیتی ہیں۔ عطیہ سید نے امریکن طرزِ زندگی اور وہاں کی تہذیب کو کمال خوبی سے اپنے افسانوں میں پیش کیا ہے۔ ان کہانیوں کو پڑھنے کے بعد قاری امریکن طرزِ زندگی اور وہاں کے باشندوں کے نفسی عوامل آسانی سے جان سکتا ہے۔ ان کہانیوں کے کچھ کردار وہاں کے ترقی یافتہ معاشرے کی عکاسی کرتے نظر آتے ہیں جبکہ کچھ کردار سماجی سطح پر زوال پذیر اور شکست و ریخت کی نمایندگی کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ یوں ان کے ہاں سماجی شعور کا واضح احساس اُبھر کر سامنے آتا ہے۔

عطیہ سید کے افسانوں کے مطالعے کے بعد یہ بات سامنے آتی ہے کہ وہ دنیا کہ دکھ، درد اور تکلیفوں کو قریب سے محسوس کرتی ہیں۔ جب وہ دنیا کو اداسی اور پریشانی کی حالت میں دیکھتی ہیں تو یہی اداسی اور المنا کی ان کے افسانوں میں در آتی ہے۔ بظاہر عطیہ سید کے افسانوں میں خوشی کی کیفیت کم ہے۔ اس کے باوجود خوش ہونے اور خوش رکھنے کی کوشش جابجا ملتی ہے۔

عطیہ سید اپنی تخلیقات میں ایک واضح مقصد رکھتی ہیں۔ وہ سماج کے دکھوں، تکلیفوں اور پریشانیوں کو اپنی ایک خاص آنکھ سے دیکھتی ہیں۔ ان کی کہانیاں ہمارے معاشرے سے ماورا قسم کی نہیں بلکہ ہمارے معاشرے کی ہی تلخ حقیقتوں کو سمیٹ کر لکھی گئی ہیں۔ ان کی بیشتر کہانیاں امریکن طرزِ زندگی کی ترجمانی کرتی ہیں لیکن ان سب کے باوجود انھیں پاکستانی معاشرے سے بھی جوڑا جا سکتا ہے۔ اگرچہ عطیہ سیّد کے زیادہ تر کردار مغربی تہذیب اور معاشرت کے پروردہ ہیں لیکن وہ مشرقی کرداروں کو بھی نظر انداز نہیں کرتیں۔

عطیہ سید ایک حساس، باعلم اور باشعور ادیبہ ہیں۔ وہ ملکی حالات پر مستحکم سیاسی اور معاشرتی نظریات رکھتی ہیں۔ مثلاً افسانہ "درویشِ رقصاں" کراچی کے موجودہ حالات پر لکھا گیا ہے۔ اس کے علاوہ افسانہ "ہمیں قتل ہو آئیں یاروں چلو" صحافت کی دنیا کی کہانی ہے۔ عطیہ سید ملکی صورتِ حال کے علاوہ عالمگیر پیمانے پر اقدار میں افراتفری اور تہذیب کی پامالی سے جو تباہی پیدا ہوئی اور امن و سکون کی فضا جس طرح منتشر ہوئی اور اس سے انسانی رشتوں پر انفرادی اور اجتماعی اثرات مرتب ہوئے، ان کی فلسفیانہ توجیح و تشریح پیش کرتی ہیں۔

عطیہ سید کے افسانوں پر تحلیلِ نفسی کے اثرات کا ثبوت جابجا دکھائی دیتا ہے۔ انھوں نے بہت سلیقے سے انسان کے ظاہری اعمال، خوف اور وسوسوں کو ان کی ابتدائی زندگی کے حالات و واقعات کی روشنی میں دیکھا ہے۔

نفسیات سے گہری دلچسپی اور فلسفہ پسندیدہ مضمون ہونے کے سبب عطیہ سید کے افسانوں پر ان دونوں مضامین کی گہری چھاپ نظر آتی ہے۔ ان کی کہانیاں شعور اور لاشعور کے کسی نہ کسی پہلو کا اظہار کرتی ہیں۔ نفسِ لا شعور بھی ان کہانیوں کا جزو لانیفک ہے۔

عطیہ سید کو نفسیات اور فلسفہ سے اس درجہ دلچسپی ہے کہ انھوں نے اپنی فلسفیانہ کتب اور مضامین کے علاوہ اپنے افسانوں میں بھی انھیں برتا ہے۔یوں ان کے افسانے فلسفیانہ خیالات کے ساتھ ساتھ ،داخلی کشمکش اور نفسیاتی الجھنوں کی بھی بھرپور عکاسی کرتے ہیں۔عطیہ سید نے شعور اور لاشعور کے ذریعے انسانی نفسیات کو اجاگر کیا ہے۔انھوں نے انسان کے نفس کے ان حقائق کو بیان کیا ہے۔جہاں عام انسان کی نظر نہیں پہنچتی۔

عطیہ سید کی کہانیوں میں ایک باقاعدہ ترتیب پائی جاتی ہے۔اسی ترتیب سے قاری کے ذہن میں وقت، مقام، کردار اور واقعہ سے متعلق جذباتی تعلق استوار ہوتا ہے۔عطیہ سید کی کہانیوں میں جذباتی مناظر بھی پائے جاتے ہیں جو کرداروں کی جذباتی کیفیت کے آئینہ دار ہیں۔ عطیہ سید کی کہانی کے کرداروں کو جانچنا اور سمجھنا بہت ضروری ہوتا ہے کیونکہ ان کی کہانی میں کردار کے ماتھے کی ایک شکن، آنکھوں کی جنبش اور چہرے کی رنگت کا بدلنا وغیرہ اندرونی کیفیات کو ظاہر کرتا ہے۔

عطیہ سید کے افسانے امریکی معاشرے کے عکاس ہیں۔ جہاں انسان کے دکھ ،درد، اذیت اور تنہائی کا احساس جابجا دکھائی دیتا ہے۔اس کے علاوہ ان کی کہانیوں میں اداسی، خود پسندی اور دکھ کی ابدیت جیسے عناصر بھی بکثرت پائے جاتے ہیں۔ان کے ہاں انسانی زندگی کا المیہ پیش کیا گیا ہے۔عطیہ سید کی کہانی کا انسان عجیب نفسیاتی کشمکش کا شکار ہے۔ تمام تر آسائشیں ہونے کے باوجود تنہائی اس کا مقدر ہے۔وہاں لوگوں کا ہجوم دکھائی دیتا ہے۔ مگر سب انسانوں کی شکل میں روبوٹ ہیں۔۔جو بے حس ہو چکے ہیں۔وہاں کسی کے پاس اتنا وقت بھی نہیں کہ وہ دوسروں کے دکھ درد میں شریک ہو سکیں۔اسی سبب ان کے افسانوں میں زندگی کی بے ثباتی کا تسلسل اُبھر کر سامنے آیا ہے۔

عطیہ سید نے امریکہ جیسی نام ونہاد ترقی یافتہ مغربی زندگی کی ایک الگ جھلک دکھا کر سب سے الگ اچھوتا انداز اپنایا ہے۔امریکی زندگی کا یہ الگ رنگ اکثریت کے لیے ایک نیا انکشاف ہے۔عطیہ سید کہانی بتانے کا ہنر جانتی ہیں۔وہ ایک خاص انداز سے کہانی کا آغاز کرتی ہیں۔کمال فنکاری سے کرداروں کو سامنے لاتی ہیں اور کہانی کو

نکتہ ءعروج تک پہنچانے کے بعد فنی مہارت سے اس کا اختتام کرتی ہیں۔ کہانی کے پلاٹ کو منظم اور بہتر انداز میں قاری کے سامنے لاتی ہیں۔

انسان بظاہر سادہ اور سلجھا ہوا نظر آتا ہے لیکن اس کا وجود شعور، لاشعور اور تحت الشعور کا مجموعہ ہے اور یہ فنکار کے گہرے مشاہدے اور نفسیاتی بصیرت پر منحصر ہے کہ وہ انسان کی ان کیفیات کا کس حد تک کھوج لگاتا ہے۔ عطیہ سید انسان کی ان کیفیات کا ادراک کرنے میں نہ صرف طاق ہیں بلکہ وہ اپنے عمیق مشاہدے اور مستقل مزاجی سے ان کیفیات کی بے لاگ عکّاسی کر کے منظرِ عام پر لاتی ہیں۔ عطیہ سید کی کہانیاں خاص مغربی ہونے کے باوجود مشرقی آویزش کا اثر لیے ہوئے ہیں۔ خود کلامی، شعور کی رو، تحت الشعور اور فلیش بیک کی تکنیک کے تحت طرزِ جدید کے افسانے لکھے گئے۔ ان کا ہاں تکنیک کا تنوع نظر آتا ہے۔

عطیہ سید نے خارجی دنیا کے ساتھ ساتھ کرداروں کی داخلی دنیا کا سراغ بھی لگایا ہے۔ اس سلسلے میں انھوں نے کرداروں کی کئی نفسیاتی بیماریوں کا برملا اظہار بھی کیا ہے۔ ان کے افسانوں میں ذہنی دباؤ، ناسٹلجیا، ہیل زائمر، فوبیا، ہسٹریا، احساسِ کمتری، احساسِ برتری اور ڈپریشن جیسی بہت سی بیماریوں کا ذکر اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ انھیں نفسیات نگاری پر مکمل گرفت حاصل ہے۔

عطیہ سید کی کہانیاں عام نفسیاتی حقیقت کو پیش کرنے کے ساتھ ساتھ انسان کی خارجی کیفیات کی بھی ترجمانی کرتی ہیں۔ عطیہ سید داخلی کیفیات کے ساتھ ساتھ خارجی حسن اور رنگا رنگیوں کو کمال مہارت سے صفحہ قرطاس پر بکھیرتی ہیں وہ کہانی کے مناظر کے سہارے فطرت کے حسن کو بیان کرتی چلی جاتی ہیں۔

عطیہ سید کا ذہن متنوع الجہات قسم کا ہے۔ ان کے افسانوں کی کہانیوں کے مختلف مفاہیم ہوتے ہیں۔ ان کے افسانوں کے مطالب سیدھے سادھے نہیں ہوتے۔ ان کی تحریروں کی فکری تہہ داری اور معنوی کثرت قاری سے یہ مطالبہ کرتی ہے کہ ان کی تحریروں کو بار بار پڑھا جائے۔ ان کے افسانے پڑھتے وقت قاری کے ذہن میں کئی سوالات ابھرتے ہیں اور وہ غور و فکر پر مجبور ہو جاتا ہے۔

عطیہ سید کا نفسیاتی شعور زندگی کی مختلف جہات کی عکاسی کی صورت افسانوں میں جھلکیاں دکھاتا ہے یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ طبقوں اور رنگ و نسل کی حد بندی کی بنیاد پر انسانوں کی حیثیت متعین کی جاتی ہے۔ اقلیتی خاندان کا کوئی فرد یا پوری فیملی اپنا مذہب اور عقیدہ تبدیل کر کے دائرہ اسلام میں داخل تو ہو جاتا ہے لیکن معاشرے میں اُسے قبولیت کی سند نہیں ملتی۔ اس کا سماجی مقام و مرتبہ اور معاشی حالت بلعموم تبدیل نہیں ہوتی۔ عطیہ سید نے ایسے بہت سے مسائل کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے۔

عطیہ سید کے افسانوں میں تصوف کی سرمستی جھلکتی دکھائی دیتی ہے۔ عطیہ سید کے ہاں متصوفانہ رجحان داخلی و خارجی دونوں حوالوں سے موضوع بنتا ہے۔ تصوف کا تعلق انسان کی ظاہری زندگی سے آدمیت کے تعلق کی وجہ سے ہے۔ خدمت خلق، احترامِ آدمیت، اخلاقی اقدار، ایثار و قربانی جیسے موضوعات بھی اس میں شامل ہیں۔ اس طرح متصوفانہ افکار و خیالات بھی عطیہ سید کے افسانوں کا حصہ بنتے ہیں۔ ان کے ہاں فلسفیانہ اور نظریاتی اساس پر مبنی افسانوں میں روحانی و باطنی مشاہدات اور اس سے وابستہ کیفیات کی مختلف جہتیں پیش کی گئی ہیں۔

المختصر ہم کہہ سکتے ہیں کہ عطیہ سید نے اپنی فکشن میں موجود منفرد موضوعات، دلکش اندازِ بیاں، نفسیاتی تجزیہ اور اپنی فلسفیانہ سوچ کی وجہ سے اردو ادب میں خاص مقام حاصل کر لیا۔

مآخذ

کتابیات

1۔ابوالاعجاز صدیقی،"کشاف تنقیدی اصطلاحات"، مقتدرہ قومی زبان اسلام اباد،1985ء

2۔ الحاج مولوی فیروزالدین، فیروزالغات،اُردو جامع، فیروز سنز، لاہور،2005ء

4۔ ٹی۔ایم۔یوسف،"جدید نفسیات"، علمی کتب خانہ اُردو بازار لاہور،2003ء

5۔ حامد بیگ، مرزا،ڈاکٹر۔"نسوانی آوازیں"۔لاہور،الاکومنیش پٹیالہ گراؤنڈ، س-ن

6۔ حمیرااشفاق،"جدید اُردو فکشن (عصری تقاضے اور بدلتے رحجانات)"لاہور، سانجھ، اکتوبر2010ء

7۔ ڈاکٹر حنیف فوق، مثبت قدریں، دبستانِ مشرق، ڈھاکہ1968ء

8۔ پروفیسر ساجدہ زیدی،انسانی شخصیت کے اسرار ور موز، یو پبلشرز اُردو بازار لاہور،2004ء

9۔ بحوالہ سلیم آغا قزلباش،ڈاکٹر،"جدید اردو افسانے کے رحجانات"، کراچی: انجمن ترقی اُردو،2000ء

10۔ سلیم اختر،ڈاکٹر،"عطیہ سید"مشمولہ:"صنفِ نازک کی کہانیاں"(مرتب)طاہر تونسوی،لاہور،الحمد پبلی کیشنز،1996ء

11۔ بحوالہ عاصم صحرائی،پروفیسر۔جے سی للّی۔"بنیادی نفسیات"اے ایل پبلشرز،ایڈیشن اوّل،1993ء

12۔ عطیہ سید"اقبال—مسلم فکر کا ارتقا"،لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز،1994ء

13۔ عطیہ سید،"حکایاتِ جنوں"،لاہور،سنگِ میل پبلی کیشنز،2001ء

14۔ عطیہ سید،"خزاں میں کونپل"،لاہور،سنگِ میل پبلی کیشنز،2004ء

15۔ عطیہ سید"دریا کنارے"لاہور،دستاویز،2014ء

16۔ عطیہ سید،"دشت، بارش اور رات"،لاہور، دستاویز، جنوری2013ء

17۔۔ عطیہ سید، "غبار"، لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز، 2012ء

18۔عطیہ سید، "فلسفیانہ مطالعات"، لاہور، اُردو اکیڈمی پاکستان، س۔ن

19۔ محمد اکرام چغتائی، تشریحی لغت، اُردو سائنس بورڈ لاہور، 2001ء

20۔ محمد خلیل، ڈاکٹر۔ سفر نامہ پاکستان۔ کراچی: بزمِ تخلیق ادب، جنوری 2012ء

انگریزی کتب

1- Crow and Crow, Educatinal psychology, American Book company New York, 1963

2 ـJames William, The principles of psychology, vol.1, Dover Publications Inc, 1950

3ـMargan Clifford T. Introduction to psychology, Tata McGraw Hill Education Pvt.Ltd, New Delhi, 1993

رسائل واخبارات

1۔ پاکستان (روزنامہ)، لاہور، ادبی ایڈیشن، 3 مارچ 2014ء

2۔ سپوتنک (ماہنامہ)، خصوصی شمارہ عطیہ سید فن و شخصیت، جلد نمبر 16، شمارہ نمبر 5۔ لاہور: سپوتنک دی مال، مئی، 2005ء

3۔ماہ نو (ماہنامہ)، لاہور، جلد نمبر 9، اکتوبر ستمبر 2001ء

غیر مطبوعہ تحقیقی مقالات

1۔ نورین رزاق،ڈاکٹر،"اُردو افسانے کی روایت اور پاکستانی عطیہ سید۔۔۔۔تحقیقی و تنقیدی مطالعہ(1947 سے عصرِ حاضر تک" مقالہ برائے پی ایچ۔ڈی(اُردو)، مملوکہ نیو کیمپس لائبریری،لاہور: پنجاب یونیورسٹی،2005۔2012

انٹرویوز/سوالنامہ

1۔راقمہ،انٹرویواز عطیہ سید،لاہور،نیوگارڈن ٹاؤن،15 جنوری 2021ء

2۔راجانئیر،انٹرویواز عطیہ سید،17اکتوبر 2019ء

3۔ عمران میر،انٹرویواز عطیہ سید،کسبِ کمال،پی ٹی وی،5مارچ 2017

متفرقات

1- راقمہ۔پرسنل فائل عطیہ سید۔فائل نمبر108/1۔لاہور:اسٹیبلشمنٹ برانچ لاہور کالج برائے خواتین یونیورسٹی

2۔ فیس بک، عامر سہیل،ڈاکٹر"عطیہ سید اور ہرمن ہیسے کا نیا اُردہ ترجمہ"،ایبٹ آباد، 8 دسمبر 2020ء

3۔ فیس بک،غلام حسین ساجد،16جولائی 2019ء